ماہنامہ

میثاق

لاہور

جنوری / فروری ۱۹۸۰ء

ماہ ربیع الاوّل

کی مناسبت سے اس شمارے میں سیرت اور تاریخ
کے موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد کی تین تقاریر یکجا
شائع کی جارہی ہیں ۔

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 - 852611)

قیمت فی پرچہ چار روپے ۲۰/

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۹ | جنوری - فروری ۱۹۸۰ء | عدد ۱

مشمولات

			صفحہ
★	عرض احوال	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
★	"التم الاعلون"	,, ,,	۶
★	درس سورۃ العصر	مولانا عبدالغفار حسن	۱۱
★	"شجرۃ من یقطین"	احمد الدین مارہروی	۱۵
★	درس حدیث	مولانا محمد حسین میر	۱۹
★	تمباکو نوشی اور شریعت اسلامی	پروفیسر رفیع اللہ شہاب	۳۲
★	سلسلۂ تقاریر سیرت : اسرار احمد		
●	نمبر ۴ - حیات طیبہ کا مدنی دور اور انقلاب نبوی کی تکمیل		۲۷
●	نمبر ۵ - خلافت صدیقی رض اور انقلاب نبوی کا استحکام		۴۶
●	نمبر ۶ - خلافت فاروقی رض و عثمانی رض اور انقلاب نبوی کی توسیع		۹
★	روداد سفر	اسرار احمد - ۱۰۵	۷

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

خدا خدا کر کے قلم کی گرہ کھلی اور چند نہایت اہم خطوط کی تحریر سے فراغت پاتے ہی پہلی فرصت میں امریکہ کے سفر کی رُوداد لکھنی شروع کی تو اس کا طول بر حساب کتاب سے آگے نکلتا محسوس ہوا۔ ادھر پرچے کی اشاعت میں پہلے ہی تاخیر ہو چکی تھی لہٰذا طے کیا گیا کہ اب جنوری اور فروری کا شمارہ مشترک شائع ہو، جو حاضرِ خدمت ہے!

وطنِ عزیز کی داخلی فضا میں امن و استحکام کے آثار پیدا ہوئے تو سرحد پار افغانستان میں انتہائی دھماکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ اس امر کا اندازہ تو کافی پہلے سے تھا کہ رُوس کسی صورت بھی افغانستان سے پسپائی اختیار نہ کرے گا، اور اپنی افواج براہِ راست اور کھلم کھلا داخل کرنی پڑیں تو اس سے بھی گریز نہ کرے گا۔ لیکن بالفعل یہ معاملہ جس ڈھٹائی کے ساتھ ہوا ہے اُس نے تو پوری دُنیا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر کوئی ایسی حکومت افغانستان میں قائم ہوتی جسے دُنیا نے تسلیم کر لیا ہوتا، جیسے کہ نور محمّد ترکئی کی حکومت تھی یا پھر حفیظ اللہ امین کی۔ اور وہ کسی دوست ملک سے مدد کی طلبگار ہوتی، تب تو ایسی کسی کارروائی کے لئے کسی درجے میں وجہ جواز پیش کی جا سکتی تھی[1] لیکن غالباً مزید خطرہ (RISK) مول لینا رُوس کی مصلحت میں نہ تھا۔ لہٰذا اُس نے کھلی جارحیّت کا راستہ اختیار کرنے میں بھی باک محسوس نہ کی۔ اور خود ہی حفیظ اللہ امین کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور اُسے قتل کیا، اور ایک ایسے شخص کی حکومت کا اعلان کر دیا جو اس وقت افغانستان میں موجود بھی نہ تھا۔

اس کے بعد چند دن کے اندر اندر رُوسی افواج جس طرح پہلے افغانستان کے قلب پر قابض ہوئیں اور پھر انہوں نے چاروں سمتوں میں یلغار شروع کر دی۔ اس سے بالکل وہی سماں بندھ گیا ہے جو قرآنِ حکیم میں یاجوج و ماجوج کے ذکر کے ضمن میں وارد شدہ الفاظ میں

---

[1] اگرچہ یہ بھی کسی مثبت سیاسی اساس پر نہیں ہے، اور اس اعتبار سے سخت ناقابلِ اعتبار ہے!

سامنے آتا ہے یعنی : وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ[1] ٥ — یعنی ایسے محسوس ہوگا جیسے وہ ہر اونچائی سے پھسلتے چلے آ رہے ہوں !

اس پس منظر میں بعض مبصرین کی یہ رائے بہت وزنی نظر آتی ہے کہ ایسے لگتا ہے کہ جیسے رُوس نے روایتی اور نیوکلر جملہ اقسام کے اسلحہ و سامانِ جنگ میں امریکہ اور اُس کے اتحادیوں پر ایسی فیصلہ کُن برتری حاصل کر لی ہے کہ اب اسے اپنی توسیع پسندی کے بوالہ شوق کی لگام مزید کھینچے رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے، لیکن اگر یہ بات کسی بھی درجے میں مبنی بر حقیقت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ "حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ" کی خدائی وعید کا وقت آن پہنچا ہے۔

اس صورتِ حال میں مسلمانوں کا اپنی صفوں کے انتشار کو دُور کرنا اور ——— "وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ" کے مطابق ہر ممکن اسلحہ اور سامانِ حرب و ضرب جمع کرنا بھی یقیناً لازمی و لابدی ہے ——— لیکن ان سے بھی مقدم اور اہم تر بات یہ ہے کہ خلوصِ دل سے توبہ و استغفار کرتے ہوئے رحمتِ خداوندی کو پکارنے کی کوشش کریں۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا" ! اس لئے کہ بندۂ مومن کی اُمید بھی اُسی تعؒ کی رحمت سے وابستہ ہوتی ہے، اور خوف بھی ہوتا ہے۔ تو صرف اُسی تعؒ کی سزا اور پکڑ کا از رُوئے الفاظِ قرآنی :

"عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا" !

یعنی تمھاری بے راہروی کی جو سزا تمھیں مل چکی ہے یا مل رہی ہے، اس کے بعد بھی اگر تم راہِ راست پر آجاؤ تو رحمتِ خداوندی اب بھی تمھیں اپنے سائے میں لے لے گی — لیکن اگر تم نے سابقہ ڈگر ہی اختیار کئے رکھی تو اللہ بھی پھر وہی کرے گا، جو پہلے کرتا رہا ہے ——— افسوس کہ اس پُرخطر مرحلے پر بھی مشاہدہ یہی ہے کہ اور ساری چیزوں کی جانب تو دھیان جاتا ہے لیکن اس اصل حقیقت کی جانب بالکل توجّہ نہیں ہو رہی۔ فَيَا لَلْاَسَفِ ——— !!!

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ پورے مشرقِ وسطیٰ کا نظم و امن متزلزل (DESTA-BILISE)

[1] کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام ÷ چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ ینسلون !

ہو چکا ہے اور صاف نظر آرہا ہے کہ دُنیا کی عظیم ترین حربی قوتوں SUPER POW-ERS کی زور آزمائی کا میدان اب اسی علاقے کو بننا ہے، جہاں توحیدِ الٰہی کے امانتدار اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلّم کے نام لیوا بستے ہیں، اور نقشہ وہی بن رہا ہے کہ ؎
آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے ٭ کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟
اِس سلسلے میں خطرے کی زد میں تو اگرچہ ترکی بھی ہے، جہاں رُوس ارمنی عیسائیوں کے ذریعے بدامنی پھیلا رہا ہے اور اس سے کہیں زیادہ ایران بھی جس کے داخلی انتشار اور امریکہ کے ساتھ آویزش نے صورتِ حال کو اور بھی زیادہ مخدوش بنا دیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر اعتبار سے شدید ترین خطرہ پاکستان کو لاحق ہے جس کے جنوب مشرق میں بھارت ایک عظیم عسکری قوت بن چکا ہے اور جہاں اندرا گاندھی دوبارہ نہایت فیصلہ کن اور مستحکم اکثریت کے ساتھ برسرِ اقتدار آگئی ہیں، اور بقول لارڈ کیرنگٹن روس بھارت گٹھ جوڑ (SOVIET-INDIA AXIS) اپنی سابقہ شان کے ساتھ برسرِکار آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت عالمی ڈپلومیسی کی سب سے بڑی جولانگاہ برّصغیر ہند و پاک بن چکا ہے۔ اور مشرق و مغرب کے چوٹی کے زعماء دہلی اور اسلام آباد آ جا رہے ہیں — اس پس منظر میں اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس ملک کی زمامِ کار ہے، اُن کے کاندھوں پر بڑی نازک ذمہ داریاں آگئی ہیں اور ہر پاکستانی مسلمان کو تمام سیاسی و گروہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح سوجھ بوجھ عطا فرمائے، اور صحیح فیصلوں تک پہنچنے کی توفیق دے۔

اندریں حالات دُعا کے علاوہ ہم درویشوں کے کرنے کا کام یہی ہے کہ "تحریکِ دعوت رجوع الی القرآن" اور "دعوتِ تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد" کے ضمن میں اپنی مساعی تیز تر کر دیں۔ اس لئے کہ رحمتِ الٰہی کو پکارنے کی سبیل یہی ہے کہ اخلاص کے ساتھ توبہ کی جائے۔ اور اللہ کے ساتھ از سرِ نَو اپنے ایمان و یقین اور عہد و میثاق کے رشتوں کو استوار کیا جائے۔ اور پوری توجہ قرآن کے ساتھ ایک مضبوط ذہنی و قلبی تعلّق قائم کرنے پر مرتکز کر دی جائے۔ اس لئے کہ قرآن ہی منبع ایمان و سرچشمۂ یقین بھی ہے اور از روئے فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام "حبلُ اللہ" بھی۔ جو اُمّت کی وحدت و یگانگت اور فکر و عمل کی یک جہتی و یک رنگی کی مثبت اساس بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس موقع

پر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کم از کم شہر لاہور میں اس دعوت کو ایک فوری مہمیز دی جائے، اور دعوتِ رجوع اِلی القرآن اور توبہ اِلی اللہ کا جو مرکز وسطِ شہر میں قائم ہے (مسجد شہداء کا درسِ قرآن اور مسجد دارالسّلام کا خطبۂ جمعہ) اس کے گرد پندرہ حلقوں کا ایک ہالہ بنا دیا جائے جہاں ہفتہ وار درسِ قرآن کے ذریعے یہ دعوت شہر کی مختلف آبادیوں میں مسلسل دی جاتی ہے۔ وہ حلقے یہ ہیں :

۱۔ ماڈل ٹاؤن ۔ میں جامع مسجد 'E' بلاک (بروز ہفتہ بعد نمازِ مغرب)

۲۔ گارڈن ٹاؤن ۔ میں جامع مسجد بدر، احمد بلاک (بروز جمعرات بعد نماز مغرب)

۳۔ گلبرگ ـــــ میں شریف مارکٹ، الیف بلاک (بروز بدھ بعد نمازِ مغرب)

۴۔ صدر ـــــ میں مسلم مسجد، کراچی محلّہ (بروز جمعۃ المبارک بعد نماز عصر)

۵۔ گڑھی شاہو ۔ میں ۶۹۔ علامہ اقبال روڈ (بروز جمعرات بعد نماز مغرب)

۶۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں کامن روم، لیاقت ہال (بروز جمعرات بعد نمازِ عصر)

۷۔ وسن پورہ ۔ میں کلینک ڈاکٹر نسیم الدّین خواجہ (بروز جمعرات بعد نماز مغرب)

۸۔ فاروق گنج میں ۲۳۔ عمر اسٹریٹ ـــــ (بروز منگل بعد نمازِ مغرب)

۹۔ برانڈرتھ روڈ میں بالاخانہ مکان ۷۵ ـــــ (بروز بدھ بعد نماز مغرب)

۱۰۔ رنگ محل میں ۱ - E ، شاہ عالم مارکٹ ـــــ (بروز جمعہ ۹ بجے صبح)

۱۱۔ ڈینٹل کالج متصل بادشاہی مسجد ـــــ (بروز جمعرات ۱۰ بجے صبح)

۱۲۔ اسلام پورہ میں ۶۔ اے کوثر روڈ ـــــ (بروز بدھ بعد نماز مغرب)

۱۳۔ ملتان روڈ پر جامع مسجد فاروقیہ، نوراللہ کالونی ـــ (بروز بدھ بعد نمازِ مغرب)

۱۴۔ سمن آباد ۶ - ایل متصل ڈونگی گراؤنڈ ـــــ (بروز جمعرات بعد نماز مغرب)

۱۵۔ لکشمی چوک میں دارالقرآن ۳۔ نسبت روڈ ـــ (بروز جمعہ گیارہ بجے دن)

مزید برآں پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے متعدد ہاسٹلوں میں ـــ مختلف ایام میں بعد نماز عصر

اِن میں سے پہلے حلقے میں تو راقم الحروف ہی کا ہفتہ وار درس ہوتا ہے۔ باقی جگہوں پر وہ نوجوان درس دیں گے جو گذشتہ سالوں کے دوران راقم کے ساتھ منسلک رہ کر اتنی استعداد بہم پہنچا چکے ہیں کہ اس کام میں راقم کے دست و بازو بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عزم میں پختگی عطا فرمائے اور ان کے اذہان و قلوب کو اپنی کتاب حکیم کے علوم و معارف کے لئے اور ان

کی زبانوں کو ان کے بیان کے لئے کھول دے اور ان کے ذریعے اس دعوت کے آگے بڑھنے کی سبیل پیدا فرما دے ——آمین یا ربّ العٰلمین ——!!

مولانا مودودی مرحوم کے مُحبّوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ کون نہیں جانتا کہ بہت وسیع ہے - اور یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ ایسی عقیدتیں اور محبّتیں عام اخبارات و رسائل کے لئے جلبِ منفعت کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور علّامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎ "یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے ❊ گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ" —— اخبارات و رسائل بھی عوام کے ممدوحوں کا نام بیچ کر کھانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے —— لیکن مولانا مرحوم کے اپنے متوسّلین کے حلقے کے اخبارات و رسائل کو تو اس ضمن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے اور اُن کے اکابر اور مدیروں کی خدمت میں یہ گذارش یقیناً بے محل نہ ہوگی کہ اظہارِ محبّت و عقیدت میں مبالغہ و غلوّ سے قطعِ نظر (اگرچہ وہ بھی نہایت غلط اور حد درجہ مضرت رساں چیز ہے) مولانا کی تصویروں کی اشاعت جس انداز سے ہو رہی ہے وہ تو مرحوم کے اپنے بیّنہ موقف کے اعتبار سے بھی صریحاً ناجائز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بچپن اور نوجوانی کے دَور کی تصویریں کھود کھود کر لانے اور پھر ان کی اشاعت کے پیشگی اشتہاروں کے ذریعے اخبار فروشی کی دکان چمکانے —— اور اس دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کا جو سلسلہ چل نکلا ہے، اُس سے تو وہ ساری قباحتیں یکدم نگاہوں کے سامنے آگئی ہیں جن کی بنا پر حضرتِ شارع علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ تصویروں کی طباعت و اشاعت کا جو سلسلہ موجودہ صحافت کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے اسے اگر "عمومِ بلوٰی" کے تحت کسی درجے میں قابلِ برداشت قرار دے بھی لیا جائے۔ (اس لئے کہ اس حمّام میں تو اب سبھی ننگے نظر آ رہے ہیں!) تب بھی محبّت و عقیدت کے اس غلوّ کے ساتھ اس انداز میں تصویروں کی طباعت و اشاعت سے تو واقعۃً خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ع "می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر!" والا معاملہ نہ ہو گیا ہو۔ لہٰذا خدا کے لئے ہوش میں آئیے اور : فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ ٥ کی زد میں آنے سے بچئے۔ فَهَلْ مِنْ مُّسْتَمِعٍ وَّهَلْ مِنْ مُّجِيْبٍ ؟

نشری تقریر

اسرار احمد

احمدہٗ و اصلّی علیٰ رسولہ الکریم
اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ★ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیمؕ

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا
وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

یہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۹ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :
("اے مسلمانو!) نہ پست ہمّت ہو نہ غمگین، اگر تم مومن ہو تو یقیناً تم ہی غالب رہو گے!"
یہ الفاظِ مبارکہ اُس مفصّل خطاب کے دوران وارد ہوئے ہیں جو سورۂ آلِ عمران میں آیت ۱۲۱ سے آیت ۱۸۰ تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات اور اس کے فوراً بعد کے مترتّب ہونے والے اثرات اور اُن سے پیدا شدہ مسائل و معاملات پر تفصیلی تبصرہ بھی ہے اور مسلمانوں کو آئندہ کے لیے واضح ہدایات بھی دی گئی ہیں۔

غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو فتح مبین اپنے خاص فضل و کرم اور خصوصی نصرت و تائید سے عطا فرمائی تھی اور یوم بدر کو جس طرح حق و باطل کے مابین امتیاز کر دینے والا "یوم الفرقان" بنا دیا تھا، اس کے نتیجے میں واقعہ یہ ہے کہ پورا ایک سال مسلمانوں کے لئے امن و سکون ہی نہیں فتح کے کیف و سرور کے عالم میں گذرا جس سے نہ صرف یہ کہ مستقبل کے لئے امید اور اعتماد کی فضا پیدا ہوئی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ بس اب آخری فتح اور غلبۂ کامل بالکل قریب ہے۔ اس "مدّ" کے عالم میں غزوۂ اُحد ایک فوری "جذر" کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔ بدر میں سترّ کفّارِ قریش ہلاک ہوئے تھے، جن میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ ایسے سردار بھی شامل تھے تو اُحد میں سترّ ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جام شہادت

نوش فرمایا۔ جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے "اسد اللہ و اسد رسولہ" بھی شامل تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے قرآن کے قاری و مُقری بھی۔ گویا جواب پورا بھرپور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی ہی آیت میں مسلمانوں کی دلجوئی فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ

یعنی "اے مسلمانو! اگر آج تمہیں کوئی چرکا لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی تو بالکل ایسا ہی چرکا لگ چکا ہے!"

بلکہ ایک دوسرا پہلو نسبتاً زیادہ تکلیف دہ یہ تھا کہ بدر میں تو مسلمانوں نے مدینہ سے اسّی میل دُور جا کر قریش کو شکستِ فاش دی تھی، اور اُحد میں دشمنوں نے انہیں عین گھر پر آ کر کاری زخم لگایا۔ نتیجۃً مسلمانوں کو یکدم اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی اور مسلمانوں کی جو دھاک غزوۂ بدر کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی اور جو رعب داب قائم ہو گیا تھا، وہ دفعتہً ختم ہوتا محسوس ہوا، جس کے نتیجے میں بددلی اور دل شکستگی کی ایک عام فضا پیدا ہو گئی اور کچھ ضعیف الایمان لوگوں کے دلوں میں تو شدید مایوسی نے ڈیرا ڈال لیا۔ اس پس منظر میں یہ عظیم آیتِ مبارکہ مسلمانوں کے لئے ایک نوید جانفزا بن کر نازل ہوئی کہ اے مسلمانو! اس عارضی اور وقتی صورت حال سے نہ پست ہمتی ہو نہ غمگین، اہل ایمان کے ابتلاء و آزمائش ـــــ اور جانچ پرکھ کے لئے دنوں کا اُلٹ پھیر اور حالات کی اُونچ نیچ میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمتیں مضمر ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی ہوتا ہے۔ اللہ کا مستقل وعدہ اپنے اہلِ ایمان بندوں سے یہی ہے کہ:

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝

کہ یقیناً آخری فتح تمہاری ہی ہوگی ـــ اور غالب تم ہی رہو گے بشرطیکہ تم ایمان پر ثابت قدم رہے ـــ اور یقین کا دامن تم نے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ؛ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اِس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی یہ آیتِ محکم اہلِ ایمان کے حق میں ابدالآباد تک کے لئے اُمّید کا ایک پیغام اور فتح و نصرت کی ایک نوید جانفزا ہے۔ خالقِ کائنات اور شہنشاہِ ارض و سمٰوٰت کے اس پختہ وعدے سے بڑھ کر اُمّید افزا، اور مسرت بخش چیز اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ وعدہ غیر مشروط

نہیں ہے، بلکہ جس طرح بندے اور رب کے مابین تمام معاملات دو طرفہ ہیں جیسے نصرت وتائید کہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ" ۔ (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدموں کو جما دے گا) ۔۔۔ یا یاد اور ذکر کہ: فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ! (پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا) یا جیسے توبہ کا معاملہ ہے کہ بندہ توبہ کرتا ہے گناہ اور معصیت کو ترک کرکے طاعت اور فرمانبرداری کی جانب پلٹ کر اور اللہ بھی توّاب ہے یعنی فوراً اپنی عنایتوں اور شفقتوں کے ساتھ متوجہ ہوجاتا ہے بندے کی جانب ۔۔۔ یا جیسے شکر کہ بندہ بھی شکر کرتا ہے اللہ کا احسان مان کر، اور اللہ بھی شکور ہے یعنی بندوں کی قدر افزائی فرماتا ہے! ۔ اسی طرح کا معاملہ اس وعدے کا بھی ہے کہ مسلمان ہی دُنیا میں سربلند ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ واقعۃً مومن ہوں ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالیں اور اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہیں کہ ؎

"ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ❊ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!"

تو وہ اسی آیۂ کریمہ میں موجود ہے ۔۔۔ اور اگر اس کی روشنی میں ہم جائزہ لیں اور ذرا غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے ساتھ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اپنے گریبان میں جھانکیں تو صاف نظر آجائے گا کہ اُمّتِ مسلمہ کی ایک عظیم اکثریّت کے قلوب و اذہان نورِ ایمان سے محروم ہوچکے ہیں ۔۔۔ اور مغرب سے اٹھنے والی مادّہ پرستانہ الحاد کی آندھیوں نے عالمِ اسلام کے اکثر و بیشتر حصّے میں ایمان و یقین کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو بالکل گُل کرکے رکھ دیا ہے۔ علّامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

"بندۂ مومن و بے ذوقِ طلب ❊ العجب، ثمّ العجب، ثمّ العجب!
رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد ❊ یا مسلماں مُرد یا قرآں بہ مُرد"

کیسے ممکن ہے کہ ایمان ہو اور انسان میں نہ ذوقِ طلب ہو نہ جوشِ عمل، نہ جذبۂ جہاد! واقعہ یہ ہے کہ اگر دو اور دو مل کر چار ہی ہوتے ہیں نہ کبھی تین ہوسکتے ہیں نہ پانچ، تو یہ بھی ناممکن ہے کہ دلوں میں ایمان موجود ہو اور پھر بھی مایوسی کے یہ بادل چھا جائیں اور خوف اور حُزن کے گھٹا ٹوپ اندھیرے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔

ذرا غور کیا جائے تو ایمان کا لفظ تو بنا ہی اَمن کے مادّے سے ہے، اور اس کا

اصل حاصل تو ہے ہی امن و سکون اور اطمینانِ قلبی کی کیفیت جس میں نہ خوف کی آمیزش باقی رہے نہ حزن کی بفحوائے الفاظِ قرآنی :

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ"

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے — اور نہ کوئی غم ان کے نزدیک پھٹک سکتا ہے! — دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات، عارضی شکست و ہزیمت یا جانی و مالی نقصان کے بارے میں اہلِ ایمان کا نقطۂ نظر سورۂ توبہ کی اس آیۂ مبارکہ میں بڑی خوبصورتی سے وارد ہوا ہے کہ —

ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ ۝

یعنی اے کافرو! اور منافقو! تم ہمارے بارے میں دو انتہائی اعلیٰ اور عمدہ صورتوں کے سوائے آخر تیسری کون سی صورت کی آس لگا رہے ہو؟ اگر ہم سب اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال کرتے ہوئے کام آجائیں اور جامِ شہادت نوش کر لیں تو ہمارے نزدیک تو اس سے بڑی کامیابی اور کوئی ہے ہی نہیں — اور اگر ہم غازی بن کر لوٹے اور دُنیوی فتح و کامرانی بھی ہمارے قدم چوم لئے تب تو تمھارے معیارات کے مطابق بھی ہم کامیاب شمار ہوں گے۔ اب تم سوچو کہ وہ کون سی تیسری صورت ہے جس کا تم ہمیں ڈراوا دینا چاہتے ہو؟ — !!

زیرِ درس آیۂ مبارکہ کا پہلا لفظ خصوصی توجّہ کا مستحق ہے — یعنی "لَا تَھِنُوْا" اس کا مادّہ وھن ہے۔ وھن عربی زبان میں ضعف کو کہتے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعف ظاہری اور عملی ہو یا معنوی و باطنی — اور فی الواقع ان میں کوئی فرق ہے بھی نہیں اس لئے کہ اندر کی کمزوری ہی ظاہری کمزوری کا سبب بنتی ہے اور ہمتوں اور ارادوں کی پستی ہی انسان کے جوشِ عمل اور جذبۂ جہاد کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ اب ذرا غور کیا جائے تو کسی مسلمان میں ہمّت کی پستی اور ارادے کی ڈھیلاہٹ صرف ایک سبب سے پیدا ہو سکتا ہے اور وہ ہے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظِ مبارکہ کی رُو سے : "حُبّ الدّنیا وکراھیۃ الموت" — یعنی دُنیا کی محبّت اور موت کا خوف! — اور یہ دونوں چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ایمان کے ضعف کا۔ اگر اللہ پر ایمان حقیقی معنوں میں موجود ہو تو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس تعالیٰ کی محبّت، اور ظاہر ہے کہ محبوب سے

ملاقات کا اشتیاق ہوتا ہے نہ کہ دُوری یا ہجر کا۔ نتیجۃً مومن کے لئے موت خوش آئند ہونی چاہئے اور حیاتِ دنیوی کا طول ناپسندیدہ، بموجب فرمانِ نبوی: "الدّنیا سجن المومن وجنّۃ الکافر!" (یعنی دُنیا مومن کے لئے قید خانہ کے مانند ہے اور کافر کے لئے جنّت!) اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

"نشانِ مردِ مومن با تو گویم ٭ چوں مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست!"

اسی طرح اگر آخرت پر حقیقی یقین ہو اور انسان کا دل گواہی دے کہ وہ اللہ کے عفو و درگذر اور فضل و کرم سے جنّت میں داخل کیا جائے گا تو کیا حیاتِ دُنیوی کا ایک ایک لمحہ اس پر شاق نہ گذرے گا۔ گویا ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے حبّ الدّنیا و کراہیۃ الموت۔ اور اس کا حاصل ہے ہمّت کی پستی اور جوشِ عمل اور جذبۂ جہاد کا فقدان ـــ یعنی وھن!

آخر میں اس حدیث شریف کا ذکر مناسب رہے گا جس میں وھن کی یہ شرح وارد ہوئی ہے۔ ایک بار آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ: "اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جیسے دسترخوان چُنے جانے کے بعد دعوت کھلانے والی مہمانوں کو بُلایا کرتی ہے!" ـــ یعنی تم اقوامِ عالم کے لئے لقمۂ تر بن جاؤ گے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ: "حضور! کیا ان دنوں ہماری تعداد بہت کم ہو جائے گی؟" ـ آپؐ نے فرمایا: "نہیں تمہاری تعداد بہت ہوگی لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر کے جھاگ اور خس و خاشاک کی سی ہو کر رہ جائے گی!" ـ مزید استفسار پر آپؐ نے فرمایا: "یہ اس لئے ہوگا کہ تمہارے اندر 'وھن' پیدا ہو جائے گا!" ـــ اور پھر اس سوال کے جواب میں کہ: حضور! یہ 'وھن' کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "حُبّ الدّنیا وکراھیۃ الموت!" ـــ یہ حدیث مبارک کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے ـــ اور اس میں ہماری پوری موجود الوقت صورتِ حال کی تصویر بھی موجود ہے، اور اس کے اسباب کی مکمّل تشخیص بھی!

اللہ تعالےٰ ہمیں اس 'وھن' کی دلدل سے نکلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

درس قرآن

سُورَۃُ الْعَصْرُ

از : مولانا عبدالغفار حسن، استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

۴ر نومبر ۱۹۸۷ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی امریکہ، کینیڈا، مصر کے دورہ اور حج کی سعادت سے مراجعت پر کراچی کے ہوٹل "جبیس" میں بعض احباب کی جانب سے ایک دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت از راہِ لطف وکرم مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہٗ استاذ الحدیث مدینہ یونیورسٹی نے منظور فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا جہاز بہت زیادہ تاخیر سے کراچی پہنچا اور وہ اس تقریبِ استقبالیہ میں شرکت نہ فرما سکے۔

مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے اس موقع پر "سورۃ العصر" کی مختصر تشریح فرمائی جو ہدیۂ قارئین ہے۔ مولانا محترم کو چند ہی روز کے بعد واپس حجاز شریف تشریف لے جانا تھا۔ اس لئے اُن کے بقول ڈاکٹر صاحب کے تشریف نہ لاسکنے کی وجہ سے یہ استقبالیہ تقریب ایک الوداعی تقریب میں تبدیل ہوگئی۔ شہر کے اس اعلیٰ اور نفیس ہوٹل میں اس موقع پر مدعوین ایک سَو حضرات میں سے تقریباً ساٹھ افراد موجود تھے۔ بقیہ حضرات کو ڈاکٹر صاحب کے نہ پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی، چنانچہ وہ شریک نہیں ہوئے۔ شرکاء میں شہر کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے بہت سے چوٹی کے لوگ موجود تھے۔ جن میں وکلاء، اخبارات کے مُدیران، صحافی، انجینئرز، اعلیٰ ملازمین، ڈاکٹرز، سابق وزیر، علماء، دانشور اور تاجر حضرات شامل ہیں۔ مولانا صاحب کا یہ درس ٹیپ سے ہمارے رفیق جناب پرویز اقبال صاحب نے منتقل کیا ہے۔ ——— خاکسار قاضی عبدالقادر۔

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ——— اما بعد ——— رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي۔

اس موقع پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مشہور مقولہ یاد آیا۔ انہوں نے کسی

ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" کہ میں نے اپنے رب کو عزائم کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔ یعنی انسان بڑے پختہ ارادے کر لیتا ہے، لیکن وہ وقت پر پورے نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت کیا ہے۔ بڑے بڑے عزائم رکھتا ہے، بڑے بڑے اُس کے ارادے ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور ہوتی ہے، لہٰذا اُس کے سارے عزائم، اُس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس وقت خیال تو یہ تھا کہ عصر اٹھنے کی مناسبت سے "سورۃ العصر" کی تفسیر بیان کی جائے۔ لیکن اتنا وقت نہیں ہے کہ یہ تفسیر مکمل ہو سکے اور ویسے بھی موجودہ صورت ایسی ہے کہ مغرب کا وقت قریب ہے تو اس لئے مناسب یہی ہے کہ چند ضروری باتیں تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں عرض کر دی جائیں۔

سورۃ العصر کا خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اس میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کو گواہ ٹھہرایا ہے اِس بات پر کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں صرف وہی لوگ خسارے سے پاک ہیں، جنھوں نے چار بنیادی اُصولوں کو اپنا لیا ہے۔ اِن میں سے پہلا اُصول ہے ایمان، دوسرا ہے عملِ صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا ہے تواصی بالصبر۔ تو عصر کے معنیٰ اصل میں آتے ہیں نچوڑنے کے عربی زبان میں، اور ظاہر بات ہے کہ جس چیز کو نچوڑا جاتا ہے۔ مثلاً جب آپ نے گنّے کو نچوڑا اور اُس کا رس نکالا، تو اب یہ رس واپس نہیں جا سکتا۔ آج کل سائنس نے کافی ترقی کی ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کوئی آلہ اب تک ایسا ایجاد نہیں ہوا کہ نچوڑا ہوا رس دوبارہ واپس جا سکے، جہاں سے اُسے نکالا گیا تھا۔ اس میں اشارہ ہے اِس بات کی طرف کہ زمانہ جو گزرتا جا رہا ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔ جس طرح کہ نکالا ہوا رس دوبارہ اُس پھل میں، یا اُس چیز میں نہیں لے جایا سکتا۔ تو فرمایا: وَالْعَصْرِ قسم ہے زمانے کی، زمانہ گواہ ہے، شاہد ہے اس دعوے پر جو بعد میں بیان کیا جا رہا ہے کہ تمام انسان یقیناً گھاٹے میں ہیں۔ البتہ وہ لوگ گھاٹے میں نہیں جن کے اندر چار باتیں پائی جاتی ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ یہاں ایمان سے مراد ایمان باللہ اور ایمان بالرّسالت اور ایمان بالآخرۃ ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی زندگی میں اور اپنی اجتماعی زندگی میں ایمان باللہ کو، ایمان بالرّسالت کو، ایمان

بالآخرۃ کو اپنا لیا، حقیقت میں انہوں نے ایک بڑا حصہ ایسا حاصل کر لیا جس سے اُن کی فلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن مکمل فلاح تب ہوگی جبکہ دوسرا اصول بھی اپنا لیں اور وہ ہے "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔ یعنی محض ایمان کافی نہیں، اس کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ لہٰذا محض کوئی عقیدہ، کوئی فکر جو انسان کے دل پر اور اس کے دماغ پر چھا جائے محض وہ کافی نہیں ہے، جب تک کہ اس کی عملی شکل نہ ہو۔ اس لئے ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب انسان کو یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، اس کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے پر، اس کے مختار مطلق ہونے پر اور اس کے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے پر تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایمان سے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو، تبدیلی پیدا ہو، بجائے شر کے خیر آئے بجائے گناہ کے نیکی اس کی زندگی میں چھا جائے۔ اس لئے فرمایا: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، اور یہاں لفظ اَلصّٰلِحٰت فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام نیکیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی قرار دیا ہے۔

آج کل کی نیکیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک روایتی نیکیاں اور ایک وہ نیکی جو کتاب وسنّت سے ثابت ہے۔ روایتی نیکی وہ ہے کہ جو عامۃ الناس نے یا آباء واجداد کی تقلید میں نیکی بن گئی۔ یہاں قرآن مجید میں اَلصّٰلِحٰت سے وہ نیکی مُراد نہیں ہے جو ہمارے رواج کی بناء پر یا غلط قوموں کی تقلید کی بناء پر، یا آباء واجداد کی تقلید کی بناء پر ہماری قوم میں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سمو دی گئی ہے۔ بلکہ اَلصّٰلِحٰت سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو قرآن مجید سے ثابت ہیں، جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کہ انسان جب ایمان لاتا ہے تو ایمان کا لازمی نتیجہ کیا ہے؟ عملِ صالح، لیکن اب ایمان اور عمل صالح کی یہ دو نعمتیں حاصل ہو گئیں تو ایک صحیح تقاضا یہ ہے کہ اب یہ نعمت متعدّی ہونی چاہیئے، انسان کی اپنی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کو پھیلائے۔ یعنی نیک بنو اور نیک بناؤ، یعنی دوسروں تک بھی اس دعوت کو، ایمان کی دعوت کو اور عملِ صالح کی دعوت کو پھیلاؤ۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا: "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"۔ کہ وہ آپس میں تلقین ونصیحت کرتے ہیں حق کی اور سچائی کی، باطل کو چھوڑ کر جو حق ہے۔ صحیح معنیٰ میں جو چیز کتاب وسُنّت سے ثابت ہے

اُس کی طرف بلاتے ہیں اور اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایک انسان جب یہ دعوت دیتا ہے، اور جب لوگوں کو حق کی طرف بلاتا ہے تو بہت سے ایسے لوگ بھی معاشرے میں پائے جا سکتے ہیں، جن کے مفاد پہ چوٹ پڑتی ہے۔ جبکہ وہ حق کی دعوت قبول کرتے ہیں یا اس کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو ان کی طرف سے پھر مخالفت ہو سکتی ہے، معاندانہ سرگرمیاں ہو سکتی ہیں، مختلف قسم کی تہمتیں تراشی جا سکتی ہیں تو ایسے موقع پر فرمایا: "وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ!" کہ وہ آپس میں تلقین کرتے ہیں صبر کی۔ لہٰذا دعوتِ حق کے لئے تین چیزیں بنیادی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دعوت سے پہلے تواصی بالحق سے پہلے علم ضروری ہے۔ یعنی جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں، پہلے اس کا علم بھی ہونا چاہیئے، جتنی بھی آپ دعوت دیتے ہیں، اجمالی طور پر یا تفصیلی طور پر اسی لحاظ سے ہمیں علم ہونا چاہیئے کہ ہم کس چیز کی طرف بُلا رہے ہیں اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ دعوت سے پہلے علم اور دعوت کے دوران حِلم — حِلم یعنی صبر، جب دعوت دینے کا وقت آیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے دعوت دیتے وقت رِقّت کی ضرورت ہے، نرمی کی ضرورت ہے، محبّت کی ضرورت ہے۔ اندازِ تبلیغ نہایت ہی اچھا ہونا چاہیئے۔ جیسے کہ فرمایا: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط یعنی یہ کہ اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت کے ساتھ، دانائی کے ساتھ اور دلنشیں نصیحت کے ساتھ۔ اور اگر کبھی بحث کی ضرورت پیش آجائے تو ایسی صورت میں ایسا طریقہ اختیار کرو جو ناگوار نہ ہو، بلکہ انتہائی حکیمانہ ہو، فرمایا:

——— "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط!" ———

تو دعوت سے پہلے، تواصی بالحق سے پہلے ضرورت ہے علم کی اور تواصی بالحق کے دوران یعنی دعوت و تبلیغ کے درمیان ضروری ہے کہ رقّت اختیار کی جائے یعنی نرمی اختیار کی جائے۔ اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے لوگ بیزار نہ ہوں۔ فتوے کی زبان اختیار نہ کی جائے۔ تکفیر کی زبان اختیار نہ کی جائے، تفسیق و تضلیل کی زبان اختیار نہ کی جائے۔ خواہ کتنا ہی انسان مخالفت پر آمادہ ہو، کتنا ہی وہ دشمن بن جائے اور مخالف کیسی ہی زبان استعمال کرے، لیکن ایک داعیٔ حق کا فرض یہ ہے کہ اُس کی زبان نہایت ہی پاکیزہ اور اُس کا اندازِ بیان نہایت ہی ستھرا ہو۔ تو دوسری چیز یہ ہے کہ دعوت کے دوران

مباحث قرآنی

شَجَرَۃً مِّن یَّقۡطِیۡن

از جناب احمدالدین مارہروی (ایم اے، ایم ایڈ)

قرآن حکیم کی سورۃ صٰفّٰت میں حضرت یونس علیہ السّلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ۝ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۝ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ۝

(اور تحقیق یونس پیغمبروں میں تھے، جب وہ بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے۔ پھر جب قرعہ ڈالنے والوں میں شریک ہوئے تو انہیں کا نام نکلا۔ پھر انہیں مچھلی نے نگل لیا اور وہ خود اپنے کو ملامت کرنے لگے۔ اور اگر وہ خدا کے نام کی تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہتے۔ تو ہم نے انھیں ایک چٹیل جگہ پر ڈال دیا۔ اور اس وقت ان کی حالت بڑی سقیم تھی اور وہاں ہم نے یقطین کا ایک پودا اُگا دیا۔ (سورۂ صٰفّٰت، آیات ۱۳۹ تا ۱۴۶)

حضرت یونس علیہ السّلام کو جس قوم کی رُشد و ہدایت کا فریضہ سپرد ہوا تھا اس کے متعلق جدید تحقیقات سے واضح ہو چکا ہے کہ عراق کے مشرقی علاقے میں آباد تھی۔ اس لئے کشتی میں سوار ہونے، مچھلی کے نگلنے اور پھر انہیں قرب و جوار ہی میں کہیں چٹیل اور بے آب گیاہ ساحل پر اُگل دینے کا واقعہ پیش آیا ہو گا۔ یہ بات بھی تحقیق ہو گئی ہے کہ جس مچھلی کا اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے وہ وہیل تھی اور میرا خیال ہے کہ بلین (BLEEN) قسم کی ہو گی، جس کے دانت نہیں ہوتے۔ بلکہ اوپر کے جبڑے یا تالو میں چھلنی کی طرح کا ایک پردہ لٹکتا رہتا ہے۔ چھوٹی غذا اس میں سے چھن کر اندر جاتی ہے، اور بڑی (جیسے کہ انسانی جسم) کو نگلتے وقت چھلنی ایک طرف ہٹ جاتی ہے، اور شکار بلا چبائے اندر چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا ہضم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بالعموم یا تو وہ اُسے اُگل دیتی ہے یا مر جاتی ہے۔ چنانچہ دونوں قسم کے واقعات مشاہدہ میں آ چکے ہیں۔

حضرت یونس علیہ السّلام جب اُس کے پیٹ میں گئے تو وہ انہیں جزوِ بدن نہ کر سکی۔ ساتھ ہی انہوں نے خدا تعالیٰ سے دعا اور استغفار کی، جس کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس طرح کیا گیا ہے:

فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (۲۱ : ۸۷)

"آخر کار انہوں نے تاریکیوں (یعنی سمندر اور وہیل کے پیٹ کی تاریکیوں) میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی حاجت روا نہیں ہے، تو پاک ہے اور میں ہی گناہگاروں میں سے ہوں۔ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اُسے غم سے نجات دی!"

اور نتیجۃً وہیل نے انہیں ایک ایسے کنارے پر لے جا کر اگل دیا جو ایک چٹیل ساحل تھا۔ اور وہاں خدا تعالیٰ نے کمال شفقت و مہربانی سے ایک نئے قسم کا شجر (پودا) اُگا دیا، جس کو یقطین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لیکن ادنیٰ تفکّر سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ یقطین کی کوئی خاص قسم تھی۔

ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن کی آیات اور اُس کی حکمتوں پر غور کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ذہن اس سوال کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت یونسؑ کی کیا حالت تھی اور ان کو کن اشیاء کی ضرورت رہی ہوگی۔

پہلی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے اور ہکائیاں لے کر نگلنے کے بعد ان کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑ گئی ہوگی، اس میں زخم پڑ گئے ہوں گے، جن پر مکھیوں کے بیٹھنے اور ستانے اور ان میں زہریلے جراثیم کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے سخت اذیّت کا سامنا ہوگا۔ دوسرے اس حالت میں سخت اور سنگلاخ زمین پر لیٹے رہنا تکلیف کا باعث ہوتا ہوگا، اور کروٹ لینے سے زخموں میں رگڑ لگتی ہوگی۔ پھر دھوپ کی تپش اوّل تو ویسے ہی تکلیف دہ ہوتی ہے اور زخموں میں تو آفتاب کی کرنیں تیر و نشتر بن کر چبھتی ہوں گی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کے لئے غذا اور پانی کی ضرورت ہوگی۔

چنانچہ باری تعالیٰ نے ان جملہ ضروریات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے وہاں یہ مخصوص پودا اُگا دیا۔ لیکن اس یقطین کا ادراک اور صحیح طور پر سمجھنا دُور بیٹھے ہوئے مترجمین اور مفسّرین کے لئے آسان ثابت نہ ہو سکا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کدو کا پیڑ کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ شاہ رفیع الدّین صاحب نے اُسے ایک درخت بیل والا یعنی کدو کہا ہے۔ مولانا اشرف علی

صاحب تھانوی نے کدو کا لفظ حذف کر دیا ہے۔ مارم ڈیوک پکتھال نے لوکی کا درخت لکھا ہے۔ مولانا محمود الحسنؒ صاحب اور مولانا شبیر احمدؒ صاحب عثمانی نے بھی شاہ صاحب ہی کا اتباع کیا ہے۔ میں خود اس کے متعلق عرصہ تک مذبذب رہا، حتیٰ کہ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ اور مجھے بحیثیت ناظمِ تعلیمات تین سال تک مکران میں قیام کرنے اور گھوم پھر کر اس تمام علاقے کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اہل مکران کی زبان مسخ شدہ فارسی ہے، لیکن اس میں دوسری بانوں بالخصوص عربی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ پنجابی اور انگریزی کے لفظ بھی شامل ہو گئے۔ بلیدہ میں ایک نیا لفظ اگین (ا۔گ۔ی۔ن) سننے میں آیا جو ایک خاص قسم کی گول لوکی کے واسطے استعمال ہوتا ہے جو تربوز کے برابر ہوتی ہے۔ ظاہری طور پر تو یہ لوکی ہی ہوتی ہے، لیکن اس کا مزا ککڑی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس میں شیرینی بھی ہوتی ہے اور پانی کا جزو تو بہت ہی زیادہ ہوتا ہے۔ چھلکا بھی اتنا نرم اور لذیذ ہوتا ہے کہ بآسانی کھا لیا جائے۔ ہمیں تو اسے بجائے پکانے کے کچا کھانے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

ایک روز یکایک خیال آیا کہ کہیں یہی تو وہ پودا نہیں جو خدا تعالیٰ نے حضرت یونس ؑ کے واسطے اس چٹیل میدان میں پیدا کیا تھا۔ اور جس کا ذکر اوپر کی آیات میں کیا جا چکا ہے۔ لفظ اگین کی ساخت پر غور کیا تو ایسا نظر آیا کہ 'ق' کا تلفظ تو موجودہ عربی کی طرح 'گ' میں تبدیل ہو گیا۔ ی، ل سے بدل گئی اور 'ط' کثرتِ استعمال سے حذف ہو گیا۔ اس طرح یقطین نے اگین کی شکل اختیار کر لی۔

اس کے بعد یہ جستجو ہوئی کہ نجانے اس کا پودا کس ماحول میں نشوونما پاتا ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ خوش قسمتی سے مکران کے صدر مقام تربت میں حکومت پاکستان کے شعبۂ تحفظ پوداجات (PLANT PROTECTION) کا بھی ایک دفتر ہے، اس سے بھی اس سلسلہ میں رابطہ قائم کیا گیا۔ پتہ چلا کہ ساحلی علاقوں میں خود رَو اُگا کرتا تھا۔ لیکن اب جو بازار میں اس کی مانگ بڑھی تو کاشتکاروں نے کھیتوں میں بھی بونا شروع کر دیا ہے۔

مکران کا ساحل طبعی طور پر ساحلِ عراق سے مشابہ ہے۔ اس کے قریب مچھلیوں کی بڑی کثرت ہے، جو قدیم الایام سے اس علاقہ کے لوگوں کی خوراک اور ذریعہ آمدنی ہے۔ چنانچہ پسنی اور گوادر کی بندرگاہوں کو ماہی گیروں کی جنت کہا جاتا ہے، اور انہیں علاقوں میں اگین کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم نے ان مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ جگہ جگہ مچھلیوں کی گلی سڑی ہڈیوں اور کانٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن پر یہ پودا اُگتا ہے، اور خوب نشوونما پاتا

ہے۔ غلاظت کے یہ انبار بہت اعلیٰ قسم کی کھاد کا کام دیتے ہیں اور سمندر کے ابخرات سے پیدا ہونے والی شبنم نیچے گر کر اُن کی آبیاری کرتی ہے۔ بیل دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہے جس کے اندر بیک وقت ایک نہیں دو چار انسان اپنے آپ کو بخوبی چھپا سکتے ہیں۔ پتے نہایت چکنے اور ملائم ہوتے ہیں، جو نیچے نرم و نازک گدّوں اور اُوپہ اوڑھنے کے لئے ریشمی چادر کا کام دیتے ہیں۔ تری اور خنکی اتنی ہوتی ہے کہ آفتاب کی کرنیں اندر چھپے ہوئے انسان کو تکلیف نہیں دے سکتیں۔ اس کا پھل جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ککڑی کی طرح نہایت لذیذ، میٹھا، سبک اور ہاضم ہوتا ہے اور مریضوں کے لئے بڑی اچھی غذا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر رطوبت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پانی نہ بھی میسّر آئے تب بھی پیاس نہیں لگتی۔

ایک عجیب بات جس نے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا یہ تھی کہ کھلے ساحل پہ دھوپ میں جہاں مچھلی پڑی ہوتی ہے وہاں کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں کی بڑی افراط ہوتی ہے لیکن اس پودے کے قریب دُور دُور تک ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ محکمہ نباتات نے اس معاملہ میں میری بڑی مدد کی۔ ان کے افسروں نے اس کے پتّوں اور ڈنٹھلوں کا کیمیاوی تجزیہ کر کے پتہ لگایا کہ اس کی رگ و پے میں جو عرق دوڑتا پھرتا ہے اس کے اندر ایک کیمیاوی مادّہ شامل ہے جو حشرات الارض کے واسطے مہلک بھی ہے اور اس کی بُو اُن کو ناگوار بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ادنیٰ کیڑے تو درکنار سانپ بچھو بھی اس طرف کا رُخ کرنے سے کتراتے ہیں ــــ قرآن مجید جس کا محض پڑھ لینا لوگ باعثِ ثواب و برکت اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، دراصل علم و حکمت کا ایک بحرِ ذخّار ہے جس میں اسی کو علم ہے کہ کتنے گوہرِ آبدار پوشیدہ ہیں۔ اور اُن کی دریافت کے لئے کتنی گہرائی تک غوّاصی کرنے کی ضرورت ہے۔ علماءِ مفسّرین و محققین چودہ سو برس سے اسی تگ و دَو میں مصروف ہیں اور انہوں نے دُنیا کو بے شمار مدفون گوہر دار فراہم کئے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس لامتناہی خزانہ کا کتنا حصّہ ایسا ہے جو ابھی تک نظروں کے سامنے نہیں آسکا۔ مجھے جب خود اس قسم کا کوئی نکتہ ہاتھ آجاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مرتبہ قرآن پڑھ چکا ہوں، یہ معمولی سی بات پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی مگر جب اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ: ؎

ذہن میں جو گھر گیا، لاانتہا کیوں کر ہوا ✧ جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا!

تو دل پکار اُٹھتا ہے کہ قرآن اسی ہستی کا تو کلام ہے۔ اس کو تو لوگ قیامت تک اسی طرح سمجھنے کی کوشش میں لگے رہیں گے، اور کل نکات کو اس وقت تک بھی حل نہ کر سکیں گے۔ ❀

درسِ حدیث

ایمان اور اس کے تقاضے

از: مولانا محمد حسین میر، اُستاذ عربی، قرآن اکیڈمی، لاہور

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں- ان میں سب سے افضل اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور سب سے معمولی، کسی تکلیف دہ چیز کو راہ سے ہٹا دینا ہے- اور حیا بھی ایمان کی ایک بہت بڑی شاخ ہے-

ایمان سے مراد ہے یقین- یقین دو قسم کا ہوتا ہے- ایک یقین وہ ہے جو فلسفی کے دلائل سے ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے- مثلاً یہ کہ یہ دُنیا حادث ہے اور ہر حادث کے لئے ایک مُحدِث (بنانے والے) کی ضرورت ہوتی ہے- لہٰذا اس دنیا کے لئے بھی ایک مُحدِث کی ضرورت ہوئی، اور وہی خدا ہے- لیکن یہ یقین یہیں تک محدود رہتا ہے- اس سے آگے بڑھ کر یہ ہماری شخصیت پر کچھ اثر نہیں ڈالتا- اس کے مقابلے میں ایک یقین وہ ہے جو خدا کے پیغمبر کی وساطت سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے- وہ ہمیں بتاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اللہ نے ہمیں پیدا کیا، بلکہ وہ انسان پر اس قدر مہربان ہے کہ سب سے پہلے تو اسے اپنی ساری مخلوق کے مقابلہ میں اَحسنِ تقویم میں پیدا کیا- پھر اسے عقل جیسا جوہر بخشا، اس کے رہنے کو زمین بنائی اور اس کا پیٹ اتنے قیمتی خزانوں سے بھر دیا کہ ان کو نکال نکال کر اور انہیں کام میں لا لا کر ہی ہم تمدّن کے اس نقطۂ عروج پر پہنچے ہیں- اگر وہ زمین میں یہ دفینے ودیعت نہ کرتا یا آج بھی انہیں اٹھائے تو ہماری موجودہ ترقی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا- اور نہ ہی ہم آئندہ اس میں رتی بھر اضافہ کر

سکتے ہیں۔ پیغمبرِ خدا ہمیں توجّہ دلاتا ہے کہ اپنے دائیں بائیں، اوپر تلے نگاہ اٹھا کر دیکھو۔ چاند اور سورج تمھاری غلامی میں سرگرداں ہیں، ہوائیں تمہارے لئے سمندر بدوش ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ غرض تم تخلیق کائنات کی غایتِ اُولیٰ اور سلسلۂ تکوین کا مقصدِ اصلی ہو۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تمھیں اپنی نیابت کا شرف بھی بخشا ہے اور فرشتوں تک کو تمھارے حضور میں سربسجود کر دیا ہے۔

اس طرح سے جو یقین و ایمان ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک زندہ و توانا ایمان ہوتا ہے جو ہمارے اندر اپنے خالق و محسن کے لئے جذبۂ امتنان و تشکّر اور محبّت و عظمت کو ابھارتا ہے۔ ہماری گردنیں بارِ احسان سے اس کے سامنے جھک جاتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اس محسنِ حقیقی کے مطیع و فرمانبردار بندے بن کر رہیں۔ ہماری زندگی کا سارا تانا بانا اسی کی رضا و خوشنودی کے اردگرد بُنا جائے۔ اس طرح پیغمبرِ خدا کے بوئے ہوئے ایمان کے اس بیج سے حُسنِ فکر و عمل کا ایک ایسا شجرۂ طیبہ پھوٹتا ہے کہ: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

فکر و عمل کا یہ شجرۂ طوبیٰ نیچے سے اوپر تک کثیر الانواع اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں جڑیں بھی ہوتی ہیں، تنا بھی، چھوٹی اور بڑی شاخیں بھی، سرسبز و شاداب پتّیاں بھی، رنگ برنگ کے مہکتے پھول بھی اور لذیذ و شیریں پھل بھی۔ یہ سب ایمان کے وہ تقاضے ہیں جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ وہ ستّر سے کچھ اُوپر ہیں۔ اکثر اہلِ علم نے اس سے مراد محض کثرت لی ہے۔ جس طرح کہ ہماری اپنی زبان میں بھی بعض اعداد سے متعیّن مقدار نہیں بلکہ کثرت ہی مراد ہوتی ہے۔ البتہ بعض دوسرے اہلِ علم — ابن حبّان، ابن حجر، اور بیضاوی وغیرھم نے متعیّن تعداد مراد لی ہے۔ اور قرآن و سنّت میں تتبع کے بعد ثابت کیا ہے کہ واقعی ان کی تعداد ستّر سے کچھ اوپر — ستّر کے قریب ہے۔

تاہم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اس ارشاد میں ان سب کی تفصیل سے تعرّض نہیں فرمایا۔ صرف دو کا ذکر کر کے چھوڑ دیا ہے اور فرمایا کہ ایمان کی ان شاخوں میں سب سے افضل اللہ تعالیٰ کے وحدہ لاشریک ہونے کی شہادت دینا ہے، جس کا تعلّق حقوق اللہ سے ہے اور اس کی سب سے معمولی یا قریبی (سہل العمل) شاخ، کسی ایسی چیز کا راستے سے ہٹا دینا ہے، جس سے کسی بھی رہ گیر کو گزند پہنچ سکتا ہو۔ جیسے کانٹا، پتھر، گڑھا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ

یہ عمل حقوق العباد کی ذیل میں آتا ہے۔گویا فکر و عمل کی ان دو انتہاؤں کا ذکر کرکے آپؐ نے درمیان کے محاسن و مکارم کو بیان کرنا اس لئے ضروری نہ سمجھا کہ آپ کے مخاطبین صحابہ کرامؓ ــ آپؐ کی تعلیمات کے نتیجے میں ان سے بخوبی واقف تھے۔ویسے بھی معروفات و منکرات کا احساس نفسِ انسانی میں فطری طور پر ودیعت کر دیا گیا ہے۔اس لئے ان کی تفصیل نہ ہی ضروری تھی اور نہ ہی مقصود، کیونکہ حضورؐ بتانا یہ چاہتے تھے کہ یہ حقوق اللہ سے حقوق العباد تک پھیلے ہوئے تمام اعمالِ حسنہ ایمان کے برگ و بار ہیں۔اگر یہ سرسبز و شاداب اور تروتازہ ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایمان میں حرارت بھی ہے اور قوت بھی۔لیکن خدانخواستہ اگر یہ پھول مرجھانے لگے ہیں یا پتیاں جھڑنے لگی ہیں یا شاخیں سوکھ رہی ہیں تو فکر کرنی چاہیئے۔معلوم ہوتا ہے ایمان کو کوئی کرم چاٹ رہا ہے، اس کی توانائیاں ختم ہو رہی ہیں۔اسکو توبہ، تجدید عہد انابت الی اللہ اور رجوع الی القرآن کے ذریعے پھر سے توانا بنایا جائے۔

اس سلسلہ میں حضورؐ کے اس ارشاد کی طرف توجہ ضرور دی جائے کہ: ادنٰھا اماطۃ الاذٰی عن الطریق۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام معاشرتی اخلاق کو بھی ایسے اعمال اور رویے بھی جن کا تعلق خلقِ خدا کے فائدے سے ہو، کس قدر اہمیت دیتا ہے۔جس دین میں، راستے میں سے کسی معمولی سی ایذا رساں چیز کو ہٹا دینے کو بھی ایمان کا تقاضا کہا گیا ہو، لازماً اس کے ہاں اس کا اصل تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ بنی نوعِ انسان کو جہالت کے خارزار سے نکالنے کے لئے درسگاہیں قائم کی جائیں۔ ان کو دکھوں اور بیماریوں کے گڑھوں میں گرنے سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ شفاخانے کھولے جائیں۔ ان میں سے معذور افراد کو سہارا دینا اور اُن میں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ان کی بحالی اور فلاح و بہبود کے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔مگر افسوس کہ رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان رکھنے والے اہل ثروت اپنے اس فرض سے اس طرح غافل ہیں کہ غیر مسلم قومیں آج بھی بجا طور پر انہیں یہ طعنہ دے سکتی ہیں کہ اسلام کے ان نام لیواؤں کو انسانی بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اس حدیث میں جو چیز خاص طور پر توجہ طلب ہے، وہ حضورؐ کے فرمان کا آخری جملہ ہے کہ : اَلْحَیَاءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ ط جس کا مطلب ہے کہ حیا بھی ایمان کی ایک بہت بڑی شاخ ہے۔ آخر حضورؐ نے ستر سے زیادہ حسنات کو چھوڑ کر صرف اس کو کیوں خاص طور پر ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس جاہلی دور کی کچھ جھلک ابھی باقی تھی جس میں عورت پورے سولہ سنگھار کے

ساتھ راہوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں بے حجابانہ نکلا کرتی تھی۔ اور لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالا کرتی تھی اور کچھ نگاہیں بھی اس کے تعاقب میں رہا کرتی تھیں۔ چنانچہ فرمایا کہ ایمان کا ایک بہت بڑا مظہر شرم و حیا بھی ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو لازم ہے کہ وہ راہ چلتے نگاہیں جھکا کر چلیں، عورتیں اپنے جسم ڈھانپ کر باہر نکلیں تاکہ اسلامی معاشرہ وقاحت و بے حیائی اور اخلاق باختگی سے پاک و صاف رہے۔ یا پھر ہمارے اس دورِ جاہلیتِ جدیدہ میں زیادہ شدّت کے ساتھ اٹھنے والے اس فتنہ کی خبر آپ کو دے دی گئی تھی۔ اس لئے آپ نے آنے والی نسلوں (جن میں ہمارا دَور بھی شامل ہے) کو انتباہ فرمایا کہ دیکھو! جب تک تم میں حیاء ہے، ایمان بھی ہے۔ جہاں حیاء رخصت ہوئی، ایمان کی بھی بس خیر مناؤ۔ کیونکہ بے حیائی غارت گرِ دین و ایمان ہے۔ یہ بے حیائی جس طرح عورتوں کے بے حجابانہ اور پوری زیب و زینت کے ساتھ کوچہ و بازار میں پھرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس برائی کے اظہار کی اور بھی بیسیوں شکلیں ہمارے ہاں مروّج ہیں۔ ہمارے شعر و ادب کا بیشتر حصّہ اسی ذیل میں آتا ہے، ٹیلیویژن، فلم اور تصویر نے اس فتنے کو سہ آتشہ بنا دیا ہے۔

ہم ان باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں، اور انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن یاد رکھئے بدعملی آخر کار یا تو ہمارے دلوں سے دولتِ ایمان کو بالکل ہی چھین لیتی ہے اور ایک بدکردار شخص بالآخر خدا و رسول ہی کا منکر ہو جاتا ہے۔ یا کم از کم ایمان کو اس قدر اَدھ مؤا اور کمزور بنا دیتی ہے کہ اس میں سے قوّتِ مزاحمت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر مغرب و مشرق سے اٹھنے والی فتنہ کی ہر لہر اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ ان میں نئے نئے فتنے جنم لیتے ہیں اور کوئی ان کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالےٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے ــــ!

اللّٰھم حبّب الینا الایمان وزیّنہ فی قلوبنا وکرّہ الینا الکفر والفسوق والعصیان واجعلنا من الرّاشدین ٥

تمباکو نوشی اور شریعت اسلامی

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

حج کے موقع پر ہر سال سگریٹ اور تمباکو نوشی کی وجہ سے آگ لگنے کا کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ضرور ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جس سے بعض اوقات کافی جانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی ایسے نقصانات کی مثالیں کم نہیں۔ ابھی چند دن پہلے کراچی میں اسی عادتِ بد کی وجہ سے ایک اسکول بس میں درجنوں معصوم بچے جھلس کر رہ گئے۔

(روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور مورخہ ۷ نومبر ۱۹۷۷ء)

چنانچہ اسی بنا پر پچھلے کئی سالوں سے یہ مسئلہ علمائے عرب کی سنجیدہ توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور وہ اس بارے میں شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں۔ ان میں بعض حضرات تو سگریٹ اور تمباکو نوشی کو شراب نوشی سے بھی زیادہ سنگین گناہ قرار دیتے ہیں۔

چند سال اِدھر کی بات ہے کہ راقم الحروف جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر ٹھہرا۔ قاہرہ کے ہوائی مستقر پر ایک عظیم کھلی مارکیٹ (سوق الحر) قائم ہے۔ جس میں ہر قسم کا ولایتی مال بغیر کسی کسٹم یا ٹیکس کے دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ کہنے کو تو وہاں ہر قسم کا مال تھا، لیکن زیادہ تر انگریزی شراب کا کاروبار تھا۔ راقم نے وہیں کے ایک عالم دین کے سامنے اس وسیع کاروبار پر حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کی نظر صرف شراب کی طرف کیوں گئی ہے، ساتھ والے سٹور میں اسی تعداد میں انگریزی سگریٹ بھی تو فروخت ہو رہے ہیں اس کا نوٹس کیوں نہیں لیتے۔ جو عملاً ہمارے لئے شراب نوشی سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ پھر انہوں نے وسیع پیمانے پر اس سگریٹ نوشی سے ہونے والے تازہ نقصانات کی طرف اشارہ فرمایا اور اُس کی شرعی حیثیت کے بارے میں یہ رہنمائی فرمائی کہ اسلامی ممالک میں سب سے پہلے سگریٹ نوشی کا ظہور مصر میں ہوا اور اُس وقت کے جید علماء نے اسے شراب نوشی کی طرح حرام قرار دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے ایک فتویٰ کی نقل مہیا کی جس میں یہ تفصیلات کسی

حد تک موجود تھیں۔ یہ فتویٰ سلطان عبدالحمید ثانی کے ایک سرکاری قاضی شیخ محمدؒ کامل ابن مصطفےٰ نے جاری کیا تھا۔ اور ترکی حکومت نے اُسے شائع کرایا تھا۔ فتویٰ کے اصل الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :۔

"تمباکو نوشی کے بارے میں سلف صالحین سے کچھ منقول نہیں، کیونکہ اُن کے زمانے میں اس کا وجود نہ تھا۔ اِس کا وجود سن ہجری کے ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد ہوا۔ جس زمانے میں مصر میں تمباکو نوشی کا رواج ہوا تو اس وقت کے مشہور علماء شیخ القالی اور شیخ الاجہوری تھے۔ شیخ القالی نے فوراً اُس کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ اور اس میں شیخ سالم النہوری کی تائید بھی شامل کی، اور اس کی حرمت پر سخت زور دیا۔ ان کے بعد شیخ الخرشی کا زمانہ آیا تو انہوں نے علماء کی ایک جماعت سے مل کر اس کی حرمت کا فتویٰ دیا۔ انہوں نے اس کی حرمت کے بہت سے دلائل دیئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمباکو نوشی بغیر کسی فائدے کے، مال کو جلا کر ضائع کرنا ہے۔ (الفتاویٰ الکاملۃ فی الحوادث الطرابلسیۃ مطبوعہ مصر ص ۲۸۶)

وطن واپس پہنچنے پر راقم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جب تمباکو نوشی کا ظہور برِصغیر ہند و پاک میں ہوا تو یہاں کے علمائے دین کا اس بارے میں کیا ردِّ عمل تھا۔ خوش قسمتی سے تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اس وقت کے ایک مشہور مجتہد عالم کا فتویٰ مل گیا۔ یہ عالمِ دین برِّ صغیر کے عظیم فقیہ و مفتی علامہ عبدالحی فرنگی محلّی تھے۔ یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ ابھی تک برِّصغیر ہند و پاک نے ان جیسا فقیہ پیدا نہیں کیا۔ فقہ میں اس بلند مرتبے کے باوجود آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک اپنا فتویٰ اپنے زمانے کے دوسرے فقہاء کو نہ دکھا لیتے، جاری نہ کرتے تھے۔ آپ نے تمباکو اور سگریٹ کے نشہ آور پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے یعنی جمادی الثانی ۱۲۹۸ھ میں اپنا یہ تاریخی فتویٰ صادر فرمایا :

"چرٹ پینا مثل حُقّہ پینے کے .... مکروہ تحریمی ہے، بلا ریب و بلاشک!
اور چرٹ پینے میں بسبب مشابہت تصاریٰ زیادہ کراہت ہے، واللہ اعلم"
(مجموعۃ الفتاویٰ مطبوعہ مطبع شوکتِ اسلام لکھنؤ ۱۳۰۹ھ جلد ۱ ص ۸۳)

بات حج کے موقع پر سگریٹ نوشی کی وجہ سے مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان سے چلی تھی۔ پچھلے سال

علمائے عرب نے اس نقصان کا سختی سے نوٹس لیا اور تمباکو کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا۔ سعودی عرب کے ڈاکٹر صاحبان نے بھی اس کی تائید کی اور اسے انسانی صحت کے لئے سخت مضر قرار دیا۔ خود سعودی عرب میں سگریٹ سازی کا کوئی کارخانہ نہیں۔ سب کا سب مال مغربی ممالک سے درآمد ہوکر وہاں پہنچتا ہے۔ سعودی عرب کی حکومت نے ان حضرات کی رائے کا احترام کرتے ہوئے سگریٹ کی درآمد پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور بابت یکم جنوری ۱۹۷۷ء)

بدقسمتی سے اس سال پھر حج کے موقع پر اسی سگریٹ نوشی کی وجہ سے صفا کے مقام پر ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ جس سے تین چار بڑی بڑی عمارات جل کر راکھ ہو گئیں اور کافی مالی نقصان ہوا، اور شاید جانی نقصان بھی ہوا ہو۔ چنانچہ اس دفعہ پھر یہ مسئلہ وہاں کے علماء کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے استعمال کو تو وہ پہلے ہی حرام قرار دے چکے تھے۔ اب انہوں نے اس کی تجارت کو بھی حرام قرار دے دیا جس کی بعض کڑی پابندیوں کے تحت حکومت نے اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ ۲/ دسمبر ۱۹۷۷ء کو خانہ کعبہ کے امام شیخ عبداللہ الخلیفی نے کعبہ شریف ...... میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اعلان کیا:

"اے مسلمان بھائی! رزقِ حلال تلاش کر۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کے بعد، اے لوگو! اللہ کا خوف کرو۔ اپنے اوپر اس کی نعمتوں کو پہچانو۔ اس نے تمھیں ہر قسم کی بھلائی اور فضل سے نوازا ہے اور جان لے کہ بھلائی کے بہت سے راستے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اے مسلمان بھائی! تم پر یہ معاملہ مخفی نہیں کہ دینِ اسلام نے تجارت کی دعوت دی ہے۔ اللہ کے بندو! شریعتِ اسلامی نے کوئی تجارت حرام نہیں قرار دی۔ مگر وہ جو ظلم، دھوکے اور مصنوعی مہنگائی پر مشتمل ہو یا ایسی چیز کو جسے دینِ اسلام نے حرام قرار دے دیا ہو۔ مثلاً شراب، نشہ، بُت اور سگریٹ نوشی کو حرام قرار دیا ہے۔ اور ان سے کسی قسم کا نفع اٹھانے کی اجازت نہیں۔ بس ان تمام چیزوں کی تجارت بھی حرام ہے، اور تجارت کرنے والے کے لئے بھی وبالِ جان ہے۔ اس سے جو آمدنی ہوگی وہ خالص حرام ہوگی، اور انسان کا جو گوشت حرام کے مال سے پیدا ہوگا، وہ دوزخ کی آگ کا زیادہ مستحق ہوگا!"

(ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی، مکہ مکرمہ / ۵ ۱۹۷۷ء - ۳۰ اپریل نمبر ۵۵۵)

کعبہ شریف میں یہ خطبہ حج کے دنوں میں دیا گیا اور اسے سننے والے ساری دُنیا کے دس لاکھ سے زیادہ حجاج کرام تھے۔ مختلف اسلامی ممالک کی مساجد میں کعبہ شریف کے اس خطبے کو عقیدۃً دُہرایا جاتا ہے۔ اس لئے اسلامی دُنیا میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں سے اکثر ایسے لوگ حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جو عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے حجاج کرام تھوڑی بہت عربی زبان جانتے ہوتے تو کعبہ شریف میں ارشاد ہونے والے اس خطبے کا ہمارے ہاں بھی بڑا اثر ہوتا اور لاکھوں مسلمان اس عادتِ بد سے نجات پا جاتے۔ اب ہم اپنے علماءِ کرام سے ہی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ سعودی عرب کے علماء کے اس فتویٰ کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں۔

کعبہ شریف کے امام صاحب کے فتویٰ کے بعد اس موضوع پر زیادہ لکھنے کی ضرورت تو نہیں، تاہم علماءِ کرام نے اس پر جو بحثیں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک مفید نکتے کی طرف اشارہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ جہاں اکثر علماء نے اسے خمر پر قیاس کرتے ہوئے حرام قرار دیا ہے وہاں بعض حضرات نے اس کی حرمت کے لئے قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ سے استدلال فرمایا ہے :-

"وہ حلال کرتا ہے ان کے لئے طیّبات (خوشگوار چیزیں) اور حرام کرتا ہے
اُن پر خبائث (یعنی گندی اور مُضرِ صحت چیزیں) (سورۃ الاعراف - آیت ۱۵۷)

قرآن مجید ایسی تمام اشیاء کو خبیث کے لفظ سے موسوم کرتا ہے۔ جن سے انسان کی صحیح نشوونما میں رکاوٹ ہو اور وہ اس کی صحت بخش بالیدگی میں حائل ہوں۔ اور تمباکو ان اشیاء میں سے ہے کہ جن کے مضرِ صحت اور انسان کی صحیح نشوونما میں رکاوٹ کے بارے میں دُنیا کے اکثر ماہرینِ صحت متفق ہیں۔ اسی لئے مجلسِ اقوامِ متحدہ نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر تمباکو نوشی کے انسداد کیلئے مختلف النوع اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔

سگریٹ نوشی کے بارے میں قدیم اور جدید علماءِ اسلام کے فتاویٰ قارئین کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ان پر عمل کر کے اس عادتِ بد سے خود بھی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی نجات دلا سکتے ہیں۔

(بشکریہ پبلک ہیلتھ ایجوکیشن سوسائٹی ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور)

حیاتِ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مدنی دور

ڈاکٹر اسرار احمد

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝
الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ وَلَوْ
لَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ
وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ
إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ
عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ۝ —— صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ ۝

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي
يَفْقَهُوا قَوْلِي —— اللّٰهُمَّ الهمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا

کل ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے اِس دور پر جو اجرائے وحی سے شروع ہوا اور ہجرت پر ختم ہوا اور اس کے کچھ اہم واقعات اور ان مراحل پر جن سے ان تیرہ سالوں میں دعوتِ نبوی گزری تھی ، غور کیا۔ میں نے کل ایک بات کہی تھی جس کی وضاحت آج کرنا چاہتا ہوں ، وہ بات یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں جب کہ حالات بالکل ہی مایوس کُن ہو چکے تھے، اُمید کی کوئی کرن کسی طرف سے نظر نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود دل برداشتہ ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے دُنیوی اعتبار سے ناکام لوٹنا پڑا۔ اِس کے بعد از خود ایک کھڑکی کھل گئی۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد سنہ ۱۱ نبوی میں ایمان لائے۔ سنہ ۱۲ میں وہ بارہ ہو گئے۔ سنہ ۱۳ میں یہ تعداد ۷۲ تک پہنچ گئی۔ مدینہ منورہ میں ابھی حضورؐ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں اور وہاں دعوت

کامیابی کے مراحل طے کر رہی ہے۔ آپ کے ایک ادنیٰ جاں نثار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک سالہ تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا۔ تو میں نے عرض یہ کیا تھا کہ اس میں کسی انسانی کوشش کو دخل نہیں۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اس میں میں نے یہ سوچا کہ کچھ مغالطہ ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یہ بات جان لیجئے کہ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک اللہ نہ چاہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسانی کوشش اور سعی و جہد کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ میں اگر یہ سمجھوں کہ میں صرف اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے سکتا ہوں تو یہ بھی شرک ہو جائے گا۔ شرک فی القدرۃ اور شرک فی الارادہ۔ قدرت اور ارادہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے، وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے ماسوا کے لئے اپنی انگلی تک کو حرکت دینا صرف اپنے ارادے سے ممکن نہیں کل جو میں نے عرض کیا یہ تھا کہ جو مساعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں اور آپ کے ساتھیوں نے جو محنتیں کیں، جو مشقتیں اٹھائیں، جس طرح جان و مال کو کھپایا، یہ اپنی جگہ اس کی نفی نہیں ہو گی اور اسی سے درحقیقت ہم پر اتمام حجت ہوتی ہے۔ کوشش کرنا ہر مسلمان کا ہر وقت فرض ہے، لیکن یہ کہ کون سی کوشش کس وقت تک بار آور ہو، اس کا فیصلہ کُلِّیَّۃً اللہ کے پاس ہے۔ ان دونوں باتوں کو بیک وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بہر حال مدینہ منورہ دار الہجرت بنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ ربیع الاوّل ۱۳ سنہ نبوی کو قبا میں تشریف آور ہوئے اور تقریباً دو ہفتے آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی بنیاد رکھی:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں تمکن عطا فرمائیں اور غلبہ دیں تو اُن کا پہلا کام یہ ہو گا کہ اقاموا الصلوٰۃ۔ اب یہاں دیکھئے کہ اس غلبے اور تمکن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ۔ اگر مشیتِ خداوندی نہ ہوتی اور مدینے میں یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حالات کا رخ کیا ہوتا۔ مشیتِ خداوندی کو اس میں فیصلہ کن دخل حاصل ہے: "اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ" جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ تمکن فی الارض

عطا ہو گیا تو اب بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو تکمیلی مرحلہ ہے: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ط اب اس کے لئے براہِ راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔ مدینہ منورہ کے بارے میں یہ جان لیجئے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارۃً عرض کیا تھا کہ تمدنی اعتبار سے وہ مکہ معظمہ سے ایک قدم آگے تھا۔ مکے میں صرف ایک قبیلہ آباد تھا، جبکہ مدینہ میں پانچ بڑے اہم اور طاقتور قبیلے آباد تھے۔ یعنی وہاں کی زندگی ابھی قبائلی سطح پر تھی اور یہاں ایک شہری ریاست قائم تھی۔ پانچ قبیلوں نے مل جل کر باہم کچھ اصول طے کر کے وہاں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ ان میں دو قبیلے اوس اور خزرج، اصل عرب قبیلے تھے اور آپ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مالکانِ دیہہ تھے۔ ان کے علاوہ تین اور قبائل یہودیوں کے تھے جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب یہاں آکر آباد ہوئے، اور کیوں یہاں آباد ہوئے۔ لیکن ایک گمان ہے کہ یہ لوگ درحقیقت یہاں اس پیشین گوئی کی بنیاد پر آئے تھے کہ آخری نبوت کا ظہور کھجوروں کے جھنڈوں والی سرزمین میں ہوگا۔ وہی پیشین گوئی جس کی بنیاد پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رہنمائی ملی۔ ایک عیسائی راہب نے انہیں بتایا کہ میرا علم یہ بتاتا ہے کہ اب نئی نبوت کے ظہور کا وقت قریب ترین ہے اور اُن کا ظہور ہوگا کھجوروں کی سرزمین میں، تو انہوں نے بھی اُدھر کا سفر اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس اُمید میں آئے تھے کہ وہاں پہنچیں جہاں اِس آخری اور کامل نبوت اور رسالتِ کاملہ کا ظہور ہونے والا تھا۔ واللہ اعلم۔

اِن پانچ قبائل میں سے جیسا کہ میں نے عرض کیا دو، اَوس و خَزرَج۔ مالکانِ دیہہ تھے، اور یہود کے متعلق یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ساہوکاروں کے تین خاندان تھے، جو وہاں آباد تھے۔ خزرج کا قبیلہ بڑا تھا اور اَوس کا چھوٹا۔ اُن کے مابین خانہ جنگی رہتی تھی اور یہودیوں کو موقع ملتا تھا۔ کبھی اِن کا ساتھ دے دیا کبھی اُن کا۔ لہٰذا رفتہ رفتہ وہ اپنا تسلّط اور HOLD مدینہ منورہ پر مضبوط کرتے گئے۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر یہ اَوس و خَزرَج بیچارے اُن کے دست نگر رہتے تھے۔ مالی اعتبار سے تو آپ کو بنیوں اور یہودیوں کا کردار معلوم ہی ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ یہودی ایک تعلیم یافتہ قوم تھے، اُن کے پاس ایک کتاب تھی تورات۔ شریعت تھی، قانون اور ضابطہ تھا، اُن کے فقہا تھے، اُن کے ہاں عدالتیں ہوتی تھیں

جو فیصلے کرتی تھیں۔ اِس اعتبار سے یہودی ایک متمدّن قوم تھے۔ مگر اَوس و خزرج کے ہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ لہٰذا ہر اعتبار سے یہودیوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ ایمان لانے والے تھے اَوس اور خزرج کے کچھ لوگ۔ اگرچہ ان میں سربرآوردہ لوگ بھی تھے، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ پورے قبیلے اس طریقے سے تو ایمان نہیں لائے تھے جس طریقے سے مہاجرین۔ وہ تو ایمان لائے تھے قبیلے کی سطح پر۔ ان میں جو افراد ELDERS OF THE CLAN تھے انہوں نے فیصلہ کیا۔ اور پورا قبیلہ ایمان لے آیا۔ تو حضورؐ جب مدینے پہنچے ہیں تو یہ دونوں قبیلے گویا کہ ایمان لا چکے تھے۔ لیکن ان سب لوگوں کے ایمان کی وہ کیفیت نہ تھی۔ بے شک ان میں وہ بھی تھے جن کی کیفیت وہی تھی، مگر ایسے بھی تھے جو صرف اپنے خاندان، اور قبیلے کی سطح پر فیصلے کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ورنہ ان پر یہود کے اثرات بہت گہرے قائم رہے۔ درحقیقت یہی POINT OF CONTACT ہے کہ جہاں سے نفاق کا مرض شروع ہوا، ایسے ہی لوگوں کو یہودیوں نے آلۂ کار بنایا، ایسے ہی لوگوں کے ذریعے سے مسلمانوں کی جماعت میں ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع ہوئیں اور ان کو موقع ملا۔ اس لئے کہ اُن سے سابقہ تعلقات، حلیف ہونے کا تعلق، پھر اُن کا ایک رعب۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ جن کی بنا پر قدم قدم پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشکلات پیش آئیں۔

یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا یہ وہ دور ہے جس کے بارے میں مغربی مفکّرین نے بھی آپ کی تعریف میں وہ تمام SUPER LATIVE ڈگریاں استعمال کی ہیں جو اُن کے پاس تھیں۔ ایک مدبّر اور سیاست دان، معاملہ فہم دوراندیش انسان، ایک نہایت ماہر صدرِ مملکت، حکمران، سپہ سالار، غرض ہر اعتبار سے تعریف کے جتنے الفاظ ممکن ہیں انہوں نے استعمال کر دیئے۔ خصوصاً منٹگمری واٹ (MONTGOMERY WATT) یہ الفاظ استعمال کرتا ہے: "ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM" - اور ہارٹ (HEART) نے جس کا کل بنی نے ذکر کیا تھا THE GREATEST مان لیا ہے کہ نسلِ آدم میں سرِفہرست حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب اس تدبّر کا تھوڑا سا نقشہ

ذہن میں جماتے چلیں ؎

آپ مدینہ تشریف لاتے ہیں - سب سے پہلے آپ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو CONSOLIDATE کیا - ایک تو وہ لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں، مکہ سے مہاجر ہو کر، لُٹ پٹ کر، یہاں اُن کا کوئی ذریعۂ معیشت نہیں - اپنا کوئی مکان نہیں - یہاں کے جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ انصار کہلاتے ہیں - یہاں آ کر سب سے پہلی بات جو آپ نے کی وہ تھا 'عقدِ مواخات'، جس کی نظیر تاریخِ نسلِ انسانی میں نہیں ملتی - انہوں نے سگے بھائیوں سے بڑھ کر مہاجرین سے سلوک کیا - یہاں تک ہوا کہ اگر کسی کے دو گھر ہیں تو اُس نے گھر تقسیم کر دیئے کہ ایک تم لے لو ایک میں رکھ لیتا ہوں - یہ اُس وقت کے جس معاشرے میں ہو رہا ہے، اس کے پس منظر کو ذہن میں رکھئے - یہاں تک ہوا کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں، اُس نے آ کر اپنے مہاجر بھائی کو لا کر گھر میں کھڑا کر دیا کہ اس وقت حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے پردہ نہیں تھا، اور کہا ان دونوں میں جو تمھیں پسند ہو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں، تم اس سے شادی کر لو - اس درجہ کی اخوت ہو تو جماعت بنیانِ مرصوص بنتی ہے - اس کے بغیر قدم آگے اُٹھ ہی نہیں سکتا -

دوسری طرف آپ نے یہود کو جکڑ لیا، آتے ہی اُن سے معاہدے کر لئے - یہود ان معاہدوں میں ایسے بندھے کہ بعد میں پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن کھُلم کھُلا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت نہ کر سکے - اِس میں حکمتِ خداوندی بھی دیکھئے - اس کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہوئی ہے - مدینے میں آنے کے بعد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سولہ مہینے بیت المقدّس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی - اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہود کو کچھ احساس ہوا کہ یہ تو ہمارے متبعین میں سے ہیں — انہوں نے ہمارا قبلہ اختیار کیا ہے - گویا انہیں فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ نئی نبوّت و رسالت ہماری سیادت و قیادت کی جڑیں کاٹ دے گی - بلکہ وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے کہ ٹھیک ہے، نبوّت تو نئی ہے، لیکن بہرحال وہ ہمارے قبلے کے پیروکار ہیں - یہ تو جب تحویلِ قبلہ کا حکم آیا ہے تو اُن کے کان کھڑے ہوئے ہیں - اب یہ معاملہ ایک نئی اُمّت کے قیام کا ہے - ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمت کی تشکیل

ہو رہی ہے۔ لیکن نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سولہ، سترہ مہینے مل گئے۔ اس میں حضورؐ نے مدینہ منوّرہ میں اپنی پوزیشن کو پورے طور پہ مستحکم کرلیا۔

اب اس کے بعد ہے اہم بات۔ رمضان المبارک ۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا اس کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ مؤرّخین نے خواہ مخواہ ایک معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ حضورؐ نے تو جنگ کا آغاز نہیں کیا، صرف DEFENCE کیا — DEFENSIVE جنگ کی تو اسلام میں اجازت ہے۔ جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ جو صورتِ حال ہے اس کو آپ سمجھئے۔ اس پہلو سے تو کہا جا سکتا ہے کہ جنگ مسلمانوں پہ ٹھونس دی گئی کہ اہلِ ایمان کو مکّہ سے نکلنے پہ مجبور کر دیا گیا۔ یہ ظلم جو مکّے کی سرزمین پہ ہوا رکھا گیا۔ گویا قریش کی طرف سے جنگ کا آغاز تھا اس لئے جو آیات میں نے ابھی آپ کو پڑھ کر سنائی ہیں ان میں قتال کا حکم دیا گیا ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ (ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے، جنھیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا بلا کسی جرم کے سوائے اس کے کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے!) تو اس اعتبار سے تو یقیناً آغاز قریش کی طرف سے ہو چکا۔ لیکن متعیّن طور پہ ہجرت کے بعد جو اقدام ہوا ہے وہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے ہوا ہے۔ یعنی آپ یہ نہ سمجھئے کہ اگر قریش چڑھائی کر کے نہ آتے تو وہ STATUS QUO تسلیم کر لیتے، ٹھیک ہے یہ گئے۔ اب یہ مدینے میں بیٹھے اپنی دعوت و تبلیغ کریں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ تو کیا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مکّے کو مشرکین کے تسلّط سے نکالنے کے لئے اور: لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط کا جو فرضِ منصبی تھا، اللہ کے دین کو غالب کرنا، اس کے لئے آپ اقدام نہ فرماتے؟ تو یہ بات سمجھ لیجئے کہ درحقیقت بعثتِ محمدی کا جو امتیازی مقصد ہے: لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط اس کے لئے اب اقدام خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے ہوگا۔ وہ اقدام کیا تھا، مکّے کی معاشی ناکہ بندی۔ لائف لائن (LIFE LINE) مکّے کی معاش کے اعتبار سے تجارتی قافلے کا وہ راستہ تھا جو مدینے اور ساحل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے، شام کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت وہاں سے ہے۔ چنانچہ باقاعدہ ایک واقعہ آتا ہے، یہ ہجرت کے فوراً بعد کا واقعہ

ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اَوس کے سردار تھے۔ مکّے میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ابوجہل نے دیکھ لیا۔ اُس نے کہا: تم نے ہمارے مفروروں کو پناہ دی ہے۔ اب ہم تمھیں یہاں نہیں آنے دیں گے۔ طواف نہیں کرنے دیں گے تو سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ذرا سوچ لو، ہم تمھارے قافلے نہیں گذرنے دیں گے، سیدھی سی بات ہے اس لئے کہ تمھاری ساری سیادت، ساری چودھراہٹ، تمھاری ساری خوشحالی کا دارومدار اِس بات پر ہے کہ اہلِ عرب تمھارے قافلوں سے تعرّض نہیں کرتے کہ یہ متولّی کعبہ ہیں۔ ہم یہ کعبے کا راستہ بند کیا تو پھر وہ PRIVILEGES جو تمھیں حاصل ہیں، حاصل نہیں رہیں گے۔ بالکل وہی بات ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چاروں طرف سے اُن کے تجارتی قافلوں کو چاروں طرف سے مخدوش بنا دیا، آپ نے چھاپہ مار دستے بھیجے۔ ایک واقعہ بھی ہوگیا جو واقعہ نخلہ کہلاتا ہے اب آپ دیکھئے کہ آپ نے نہ صرف شام کے تجارتی راستہ پر، بلکہ مکّے اور طائف کے درمیان کا جو راستہ ہے اس پر بھی ایک طرح کی PICKETING کی ہے۔ چند افراد کا ایک دستہ مرتّب کیا اور کہا کہ نخلہ کے مقام پر چلے جاؤ، قیام کرو، اُن کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھو۔ اگرچہ حضورؐ کی جانب سے حکم نہیں تھا۔ لیکن اتفاقاً وہاں مڈھ بھیڑ ہوگئی۔

مسلمانوں کے ہاں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ حضرمی مارا گیا۔ اب اتفاقاً کہہ لیں یا مشیّتِ ایزدی کہہ لیں، ہجرت کے بعد پہلا خون مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ اُن کا ایک بڑا قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں گیا۔ اب وہ شام سے واپس آرہا تھا۔ اُدھر مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ حضورؐ کو حکم ہوا کہ نکلئے۔ مدینہ منوّرہ میں حضورؐ نے اپنا ارادہ واضح نہیں فرمایا، نفیرِ عام بھی نہیں تھی کہ ہر مسلمان ضرور چلے۔ آپ ایک جمعیّت لے کر نکلے۔ ابھی آپ نے کچھ ظاہر نہیں فرمایا کہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ذرا باہر نکل کر آپ نے مجلسِ مشاورت منعقد کی اور فرمایا! مسلمانو! دو جماعتیں ہیں، ایک شمال سے قافلہ آرہا ہے اُس کے ساتھ بہت سا مالِ تجارت ہے۔ صرف پچاس محافظوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ ہے۔ اُدھر چونکہ ابوسفیان کو کچھ اندیشہ ہوگیا تھا۔ اُس نے مکّہ مکرّمہ کی طرف قاصد دوڑا دیئے کہ ہوسکتا ہے ہم پر حملہ ہو، لہٰذا احفاظت کا ایسا انتظام کرو کہ ایک دستہ

آجائے جو ہمیں ESCORT کرے۔ اُدھر ابوجہل کا مزاج HAWKS کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح جنگ ہو، فوج کشی کریں اور اسلام کے اس چراغ کو گُل کر دیں۔ اُس نے اِس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک واویلا مچا دیا کہ تمھاری ساری دولت خطرے میں ہے اور تمھارے تجارتی قافلے کو محمدؐ لوٹنا چاہتے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) چنانچہ اُدھر سے ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر آیا۔ حضورؐ نے فرمایا اب یہ دو جماعتیں آ رہی ہیں۔ مسلمانو! بتاؤ، کدھر کا قصد کریں۔ سورۂ انفال میں اس پوری مشاورت کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اے مسلمانو! وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔ کہ تم تو چاہتے تھے کہ تمھیں وہ جماعت ملے جس میں کانٹا نہ چبھے۔ بہرحال بربنائے طبعِ بشری یہ تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا کہ لقمۂ تر کو چھوڑ کر لوہے کے چنے کو چبانے کی کوشش کرے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو طے کر چکے ہوں کہ تن من دھن اللہ کی راہ میں لگا دیں گے۔ اِس لئے ظاہر ہے کہ اس جماعت میں بھی وہ لوگ تھے، جن کی رائے یہ ہوئی کہ قافلے کی طرف چلنا چاہیئے۔ یہ مشورہ دراصل ساتھیوں کے MORALE کو دیکھنے کے لئے تھا۔ اندازہ کیا ہے کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ حضورؐ مشورہ طلب کر رہے ہیں، ایک اپنی بات کہہ رہا ہے تو دوسرا اپنی۔ ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ تقریر کرتے ہیں کہ نہیں حضورؐ لشکر کی طرف چلنا چاہیئے۔ حضورؐ متوجہ نہیں ہو رہے۔ مہاجرین میں سے کچھ اور نے تقریریں کیں، حضورؐ نے اہمیت نہ دی۔ آخر میں حضرت مقدادؓ نے تقریر کی اور بڑی پیاری تقریر کی کہ حضور ہمیں حضرت موسیٰؑ کے وہ ساتھی نہ سمجھئے جنھوں نے جنگ کا مرحلہ آیا تو کہہ دیا تھا کہ:

"اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۝"

ہم وہ نہیں ہیں، لیکن حضورؐ اِدھر بھی التفات نہیں فرما رہے۔ اب انصار کو خیال ہوا کہ معاملہ اصل میں ہم سے ہے، اور وہ بات ذہن میں رکھئے جو میں نے کل عرض کی تھی کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ جس کے نتیجے میں مدینہ منوّرہ دارالہجرت بنا اور حضور یہاں تشریف لائے۔ اس میں یہ چیز شامل نہیں تھی کہ مدینے سے باہر نکل کر بھی حضورؐ کے ساتھ ہو کر جنگ لڑیں گے۔ اس میں یہاں تک IMPLIED تھا

کہ اگر مدینے پر کوئی حملہ کرے اور وہاں حضورؐ کو کوئی گزند پہنچانا چاہے، تب انصار پابند تھے کہ وہ حضورؐ کی حفاظت کریں گے۔ اس سے زیادہ کا ابھی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اب کھڑے ہوئے ابن عبادہؓ، یہ رئیس اعظم تھے خزرج کے اور خزرج بہت بڑا قبیلہ تھا اوس کے مقابلے میں، کم سے کم تین گنا، تو رئیسِ انصار اصل میں یہی تھے۔ ان کی تقریر بڑے معرکے کی تقریر ہے۔ انہوں نے کہا اس بیعتِ عقبہ والے معاملے کو اب آپ بھول جائیے: اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ۔ ہم آپ ایمان لا چکے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اب آپ کا جو ارادہ ہو جو قصد ہو، اگر آپ ہمیں سمندر کے کنارے لے جا کر کھڑا کر دیں گے اور ہمیں اس میں چھلانگ لگانے کے لئے کہیں گے تو بے دریغ اس میں چھلانگ لگا دیں گے، تو بسم اللہ کیجئے، جدھر چلنے کا ارادہ ہے چلئے۔ یعنی کسی تردّد کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ اب یہاں کا معاملہ اور ہے، اب معاملہ ہے نبوّت کا، رسالت کا اور اُمّت کا۔ بیعتِ عقبہ کے وقت شرائط کیا تھیں اور کیا نہیں تھیں، اُن کو رہنے دیں۔ چنانچہ قافلہ بدر کو روانہ ہو گیا۔ اور دیکھئے عجیب بات ہے بدر کی، مشیّتِ ایزدی بعض اوقات بندوں کی مشیّت کے ساتھ آ کر منطبق ہو جاتی ہے۔ ایک طرف دشمنِ خدا چاہتا ہے کہ جنگ ضرور ہو۔ اُسے اپنی طاقت کا نشہ تھا، ایک ہزار کا کیل کانٹے سے مسلّح لشکر لے کر آیا تھا اس لئے سمجھتا تھا کہ فتح یقینی ہے۔ لہٰذا اُس نے کہا تھا کہ یہ یوم، یومِ فرقان ہو گا۔ قرآن مجید نے بھی سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کا نام دیا ہے۔ یہ اصل میں اسی کا دیا ہوا نام ہے، جس کو قرآن نے ADOPT کر لیا ہے۔ طے ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر اور یہ اس لئے کہہ رہا تھا کہ اس کو اپنی فتح کا یقین تھا۔

دوسری طرف اللہ فرماتے ہیں کہ ہماری بھی مشیّت یہی تھی کہ ٹکراؤ ہو: لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ ۔ ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہو جائے:۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔ تاکہ جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جو مرے وہ بھی دلیل کے ساتھ مرے!۔ اب خدائی مشیّت اور ابوجہل کی مشیّت نپٹنے کے اعتبار سے ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی۔ یہ بھی جانئے، میں نے ابھی لفظ HAWKS استعمال کیا تھا۔ قریش میں HAWKS

بھی تھے اور DOVES بھی، نیک لوگ بھی تھے۔ کل بھی میں نے ایک شخص کا ذکر کیا تھا، مطعم بن عدی کا جو طائف سے واپسی پر حضورؐ کو اپنی امان میں مکے میں لے کر گیا تھا۔ اسی طرح عقبہ بن ربیعہ ایمان نہیں لایا۔ کفر ہی پر مرا لیکن شرافت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تصادم ہو۔ حکیم بن ہشامؓ جو بعد میں ایمان بھی لے آئے، وہ بھی چاہتے تھے کہ تصادم نہ ہو، یہاں فوج پڑی ہوئی ہے، قافلہ نکل گیا وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ منكم۔ وہ تو چلا بھی گیا، لہٰذا یہاں پر عقبہ بن ربیعہ اور حکیم بن ہشامؓ نے تحریک شروع کی کہ جس مقصد کے لئے ہم آئے تھے وہ تو پورا ہو گیا۔ ہمارا قافلہ تو محفوظ نکل گیا۔ اب کاہے کو خوں ریزی کی جائے۔ محمدؐ کو عرب کے حوالے کر دو، خود نپٹ لیں گے۔ یہاں پر بھی دانش مندوں کی سی بات کی ہے، بہرحال ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ محمدؐ کو جو عرب کے حوالے کر دیا جائے گا تو اگر محمدؐ جیت گئے تو آخر وہ ہمارے ہی تو ہیں، ہماری ہی جیت ہوگی۔ دیکھئے اُن کا وہی نسلی اور قبائلی تعلق۔ ایک قریشی اگر پورے عرب پر غالب آجاتا ہے تو غالب کون آیا۔ قریش کا قبیلہ اور اگر عرب اس پر غالب آگئے تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو گیا۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے ہاتھوں کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے خون سے رنگین کرتے ہو۔

بات اتنی وزنی تھی کہ پورے لشکر میں پھیل گئی کہ ٹھیک ہے، جنگ نہیں ہونی چاہئے۔ ابوجہل ڈٹا ہوا تھا کہ جنگ ہوگی، اس لئے آخری وقت ایک ہتھکنڈہ کیا۔ نخلہ کے واقعہ میں جس کا میں حوالہ تھا، عمرو ابن عبداللہ حضرمی مارا گیا۔ اس کے بھائی کو بلایا اور اُسے انتقام لینے پر اُکسایا۔ چنانچہ اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے چیخا اور پکارنا شروع کر دیا کہ غدّاری ہو رہی ہے۔ میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جانا چاہئے۔ ابوجہل نے عتبہ بن ربیعہ کو بھی عرب حمیّت کے حوالے سے طعنہ دیا کہ بزدلی دکھا رہے ہو۔ اس نے کہا کل میدان جنگ میں پتہ چلے گا کہ بزدل کون ہے۔ گویا وہ عربی حمیّت جوش میں آگئی اور اس طرح جنگ ہو کر رہی۔ اب جنگ سے پہلی رات کا ذرا تصوّر کیجئے۔ اُدھر ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس لشکر اور اِدھر صرف تین سو تیرہ آدمی، ستّر اونٹ اور دو گھوڑے، تلواریں بھی سب کے پاس نہیں۔ وہ تو مدینہ سے جنگ کے لئے نکلے ہی نہ تھے، نہ انہیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا۔ قوم

وہ ہے جس کو عرب میں لڑاکا قوم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا یعنی انصار۔ اور صبح ٹکراؤ ہونے والا ہے۔ دونوں نوجوں کے عین بیچوں بیچ گھانس پھونس کی ایک جھونپڑی بنائی گئی، جس کے اندر اللہ کا رسول سربسجود ہے۔ بڑا طویل سجدہ، بڑی طویل دعا ننگی تلوار لئے ہوئے حضرت ابوبکرؓ پہرے پر کھڑے ہیں۔ اس رات کے حوالے سے حضرت علیؓ کا ایک قول ملتا ہے۔ ہم میں سب سے زیادہ شجاع ابوبکرؓ تھے۔ اس لئے کہ اس شب کو جو سب سے زیادہ خطرناک شب تھی۔ محمدؐ کے پہرے دار ابوبکرؓ تھے۔ اس وقت حضورؐ نے جو دعا مانگی ہے، اگرچہ اس میں بہت ہی عاجزی اور تضرع تھا تاہم نیاز سے بڑھ کر اُس میں ناز کا انداز تھا:

"اے اللہ! اگر یہ لوگ کل یہاں ہلاک ہوگئے تو پھر قیامت تک تجھے پوجنے والا کوئی نہ ہوگا!"

کیوں؟ بات واضح ہے۔ مَیں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی کمائی یہ ہے جو مَیں نے میدان میں لاکر ڈال دی ہے۔ اِس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ حضور! بس کیجئے، بس کیجئے! پھر آپ نے پیشانی اٹھائی، فتح کی خبر ملی۔ آپؐ نے صبح کے وقت بتادیا کہ فلاں کافر فلاں جگہ قتل ہوگا۔ یہ ہے وہ یوم الفرقان، یوم التقی الجمعان۔ ابوجہل قتل ہوا ہے۔ حضرت معاذ اور معوّذ دو (TEEN AGERS) تھے، جنھوں نے قتل کیا، دونوں انصاری نوجوان تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے آکر پوچھتے ہیں۔ چچا جان! ہم نے سُنا ہے کہ ابوجہل نامی کوئی شخص مکہ کا باشندہ ہے جو ہمارے نبیؐ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچاتا ہے، وہ کہاں ہے، ہمیں بتادیجئے۔ انہوں نے اشارہ کیا۔ وہ ہے ابوجہل۔ سپہ سالار کی حیثیت میں تھا، کسی خاص مقام پر کھڑا تھا۔ یہ دونوں تیر کی طرح پہنچے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اُس کا کوئی باڈی گارڈ بھی ہوگا آس پاس بھی کوئی ہوگا۔ مگر یہ کسی کو سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ دو نوجوان جو دوڑتے ہوئے آرہے ہیں، یہ کاہے کو آرہے ہیں، اُن کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی۔ دونوں نے جاکر اسے قتل کیا ہے، گرایا ہے۔ زمین پر گرا ہے اور جب گردن کاٹنے لگے ہیں تو کہنے لگا کہ گردن ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ جب نیزے پر رکھو تو معلوم ہو کسی سردار کا سر ہے کہ اُونچا سر ہے۔ اور حضورؐ جب اُس کی لاش پہ آئے ہیں اور آپ

نے اس کی گردن پہ پاؤں رکھا ہے تو فرمایا کہ : ھٰذا فرعون ھٰذہ الامّۃ کہ یہ اس اُمّت کا فرعون ہے۔ ان کے ستّر افراد مزید قتل ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی وہ بات صحیح ثابت کر کے دکھا دی۔ چنانچہ پہلا شخص جو میدانِ جنگ میں آیا وہی تھا۔ حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں واصلِ جہنّم ہوا اور یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ شروع میں جب تین افراد کفّار کی طرف سے اور ادھر سے تین انصاری ان کے مقابلے کے لئے نکلے تو عتبہ نے چیخ کر کہا کہ اے محمدؐ! ہماری بے عزّتی نہ کرواؤ۔ یہ ہمارے مقابل کے لوگ نہیں ہیں، ہم اِن چرواہوں سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہمارے لئے جو ہمارے مدِّمقابل ہیں، ان کو بھیجو۔ تب حضرت حمزہ، حضرت ابوعبیدہ اور حضرت علی نکلے۔ بہرحال میں نے اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ یہ نقطۂ آغاز بھی ہے اور الفیصلہ کن معرکہ بھی یہی تھا۔ جس نے کہ تاریخ کو بدل دیا۔ اسی لئے اُسے ابوجہل نے بھی یوم الفرقان اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں اسے وہی نام دیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ دو فریقوں میں باہم کوئی نسبت ہی نہیں۔ اتنا بڑا لشکر کیل کانٹے سے مسلّح ہو کر اور غرقِ آہن ہو کر آئے اور پٹ جائے اس چھوٹے سے دستے کے ہاتھوں جن کی اکثریّت کا شتکار تھی بقول ان کے اور وہ جنگجو لوگ بھی نہ تھے۔ کوئی ساز و سامان نہیں، اسلحہ نہیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ یہی بات ہے جس کی وجہ سے درحقیقت اس کو 'یوم الفرقان' کہا گیا۔

اب ذرا آگے چلئے، ویسے تو یہ ہے کہ صرف غزوۂ بدر پر جی چاہتا ہے کہ ایک مکمل تقریر ہو، مغالطے ہی ختم ہو جائیں۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ اقدام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا۔ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف آئے۔ اوس و خزرج میں اگر کچھ لوگ ابھی مذبذبین تھے تو اُن کے دل بھی ٹھک گئے۔ بات یہی معلوم ہوتی ہے، ٹھیک ہے۔ یہ جو نفری اگلے سال آئی، اللہ تعالیٰ نے اس کی چھانٹی کی۔ غزوۂ احد کی جو حکمت ہے اس کو ذہن میں رکھئے، درحقیقت وہ PURGE اور تطہیر اور چھانٹی کے لئے تھا۔ یہ کچّے پکّے لوگوں کی بھیڑ جو محمدؐ کے گرد جمع ہو گئی۔ ابھی تو عالمی سطح پر انقلاب کے لئے بڑی ہی محنتِ شاقّہ کی ضرورت ہے۔

اس فتح کے نتیجے میں اگر لوگ جمع ہو گئے تو جماعت بحیثیتِ مجموعی کمزور ہو جائے گی۔
ایک ہی سال بعد شوال ۳ھ میں جوابی حملہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ہوا جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تین ہزار کا لشکر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے۔ ان کی ہمتیں دیکھئے کہ عین مدینہ منورہ تک پہنچ گئے۔ دامنِ اُحد میں جو معرکہ ہو رہا ہے، مدینے سے کل چھ میل کا فاصلہ ہے۔ یہاں مشاورت ہوئی، کیا کرنا چاہیئے۔ حضورؐ کی اپنی رائے یہی تھی کہ شہر کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے۔ یہاں پھر دیکھئے۔ کون سی دو رائیں مل رہی تھیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جائے تو بڑا دلچسپ ہے۔ وہاں مشیّتِ خداوندی اور خواہشِ ابوجہل اور یہاں رائے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور رائے منافقِ اعظم عبداللہ بن اُبی کی ایک ہو گئی۔ عبداللہ بن اُبی کی رائے بھی یہی تھی۔ اور یہ بات سمجھ لیجیئے کہ یہ خزرج کا بہت بڑا سردار تھا۔ اس حد تک کہ اس کی بادشاہت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ اس کو مدینے کا بادشاہ مان لیا جائے گا۔ تاج تیار ہو چکا تھا، صرف تاجپوشی کی رسم باقی تھی کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ اور اس کی بادشاہی و سیادت وقیادت کا چراغ گُل ہو گیا۔ لہٰذا اس کے دل میں جو عداوت اوّل روز سے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی، اس کا آپ اندازہ کر لیجیئے۔
قبائلی اثرات کے تحت وہ بھی ایمان تو لے آیا لیکن ہے یہ منافقِ اعظم، منافقین کا سردار۔ اس کی بھی رائے یہ تھی کہ اندر رہ کر لڑیں۔ ہماری اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھلے میدان میں جا کر مقابلہ کر سکیں تین ہزار کے لشکر کا، لہٰذا مدینے میں محصور ہو کر جنگ کیجیئے۔ اس کے الفاظ بھی یہ ہیں کہ یارسول اللہ! مدینے کی تاریخ ہی یہ ہے کہ جب ہم نے باہر نکل کر مقابلہ کیا ہے تو اکثر ہمیں زک اٹھانی پڑی ہے، اور اگر ہم نے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا تو ان کے فوجیوں سے ہمارے نوجوان لڑتے تھے اور اوپر سے ہماری عورتیں، بچے ان پر سنگ باری کرتے تھے، اور وہ تنگ جگہوں پر پٹ کر آتے تھے، لہٰذا ہم جیت جاتے تھے۔ رائے حضورؐ کی بھی یہی تھی، لیکن وہ نوجوان جو خاص طور پر فتح بدر کے بعد ایمان لائے تھے، جوش میں تھے، بڑی تقریریں ہوئیں۔ کہا گیا کہ ہمیں شہادت چاہیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات مان لی۔

فیصلہ ہوگیا کہ کھلے میدان میں لڑیں گے۔ اس کے بعد جب آپ حجرے سے برآمد ہوئے تو زرہ پہنی ہوئی تھی، تو لوگوں کا اتھا ٹھنکا کہ بات تو صاف ہے، اور چاہا کہ اپنی رائے واپس لیں مگر حضورؐ نے فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔ سورۂ آلِ عمران میں باقاعدہ حکم ہے کہ: شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کہ اُن سے مشورہ کیا کیجئے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ۔ کہ جب فیصلہ کر لو تو پھر ڈٹ جائیں اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ یہ بار بار کے فیصلے بدلنے اچھے نہیں۔ بہرحال جنگ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں بڑی تفصیل سے بیان کیا کہ مسلمانو! تمھیں جو زک اٹھانی پڑی وہ اس لئے اٹھانی پڑی کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی کمزوریوں سے واقف ہو جاؤ۔ ہم نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ پہلے مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن فتح کے نتیجے میں جب مالِ غنیمت جمع کیا جا رہا تھا، وہ پچاس تیرانداز جنھیں حضورؐ نے مقرر کیا تھا، مالِ غنیمت کے لالچ میں اپنی جگہ سے ہٹ گئے:

حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ

کہ وہ مالِ غنیمت جو تمھیں پسند ہے جب وہ سامنے آیا تو تمھیں یاد نہ رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا تھا۔ عبداللہ بن اُبی پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو لے کر علیحدہ ہو گیا تھا۔ معلوم ہوگیا کہ مسلمانوں کی جماعت میں اب یہ منافقین کا عنصر شامل ہو چکا ہے۔ ہزار کو لے کر نکلے تھے، تین سو چلے گئے، سات سو رہ گئے تین ہزار کے مقابلے میں۔ ابتدائی فتح کے بعد شکست ہوئی اور ستر مسلمان ہی دامنِ احد میں شہید ہوئے بالکل وہی تعداد ہے جو میدانِ بدر میں مشرکین کے مقتولین کی تھی:

"تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ"

(ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں!)

حضرت حمزہؓ شہید ہوئے، حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہوئے، وہ مصعب بن عمیر جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ جن کا ایک ایک جوڑا دو دو سو درہم کا ہوتا تھا اور شام سے دُھل کر آیا کرتا تھا۔ معطر لباس پہنے ہوئے مکے کی گلیوں میں نکلا کرتے تھے تو اشارے ہوتے تھے کہ وہ کون جا رہا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

لائے اور مُقری بنا کر مدینے بھیج دیئے گئے اور حال یہ ہو گیا کہ بدن پہ سوائے پیوند لگے ہوئے کمبل کے اور کچھ نہیں۔ واقعہ آتا ہے کہ حضورؐ مسجدِ نبوی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سامنے سے گزر ہوا، ایک پھٹی ہوئی کملی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ اور جب دامنِ اُحد میں شہادت کا مرتبہ ملا ہے تو اُن کی تدفین کے وقت یہ مسئلہ سامنے آیا کہ شہید کا تو کوئی کفن نہیں، سوائے اُن کپڑوں کے جو اُس وقت ان کے بدن پہ ہوں، اور اُن کے بدن پہ ایک ہی چادر تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ پورا جسم ڈھکتا نہیں تھا۔ اگر سر کو ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں کو ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا کہ کیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا اُن کے سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ یہ آخری لباس ہے اُس دو دو سو درہم کا جوڑا پہننے والے کا۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق آتا ہے کہ اُس کے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے تھے، عرب معاشرے کے اس خوش پوش نوجوان کے کپڑے شام سے دُھل کر آیا کرتے تھے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُن کی لاش کا مُثلہ ہوا، کلیجہ چبایا گیا۔ جو کچھ قلبِ محمدیؐ پہ بیت رہی ہے آپ ذرا اُس کا تصوّر کیجئے۔ کل بھی میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے سینے میں کوئی پتھر کا ٹکڑا نہیں تھا، بڑا حسّاس قلب تھا۔ جو کچھ بیت رہی ہے اس کا اظہار ہوا۔ جب مدینے تشریف لائے، مدینہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے، ستّر شہداء، ہر گھرانے سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اُس وقت حضورؐ کی زبان پہ یہ الفاظ آئے: "اَمَّا حَمْزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَهٗ!" (کہ حمزہ کے لئے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!)۔ انصار اپنے گھروں میں گئے اور اپنی خواتین کو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن اور حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی کے پاس بھیجا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، خود کی کڑیاں، تلوار کے شدید وار کی وجہ سے پیشانی کی ہڈی میں گھس گئیں۔ آپ پر غشی طاری

ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہوگیا کہ حضورؐ کا انتقال ہوگیا، شہید ہوگئے۔ یہ سارے واقعات وہ ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ بہرحال ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدر کی فتح کے بعد جو فضا بنی تھی اب اُس کے بالکل برعکس ہوگئی۔ وہ دھاک جو بیٹھی تھی، ختم ہوگئی اور اُحد کے بعد ہوا اُکھڑ گئی۔ یہ بھی جیسے لوگ ہوتے ہیں، ویسے ہی تھے۔ ستّر آدمی اُن کے مارے گئے تھے، ستّر اُن کے شہید ہوگئے۔ لہٰذا اب جو وقت آیا ہے، وہ حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے بھی شدید ترین ہے، اور صحابہ کرامؓ کے لئے بھی۔ چاروں طرف سے قبائل شیر ہوگئے۔ آج ادھر سے آکر کوئی چھاپہ مار گیا کل اُدھر سے آکر کوئی حملہ کر گیا، کوئی اونٹ لے کر نکل گیا کوئی آکر نخلستانوں میں آگ لگا گیا۔ ادھر سے یہودی بھی شیر ہوگئے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کی سازشیں ہو رہی ہیں، بظاہر دعوت میں بلایا جا رہا ہے، اُوپر سے پتھر برسانے کی اسکیم بن رہی ہے، طرح طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضرتِ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہ تہمت لگ گئی ہے، جس میں غیر تو بغیر کچھ اپنے بھی ملوّث ہوگئے ہیں۔ یہ دو سال آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بڑے کٹھن گزرے ہیں۔ اس کٹھنائی اور اس سختی کا نقطۂ عُروج ہے غزوۂ احزاب۔

یہ بات ابھی تک عقدۂ لاینحل ہے کہ غزوۂ اُحد میں تقریباً فیصلہ کُن فتح حاصل کرنے کے بعد مشرکین واپس کیوں چلے گئے، بہرحال چلے گئے۔ انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُدھر حضورؐ کو بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ کچھ دُور جا کر ہی سوچیں گے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی، اور پھر پلٹنے کا خیال کریں گے۔ لہٰذا اگرچہ مسلمان زخموں سے چور چور تھے۔ اُن سے فرمایا کہ اُن کا پیچھا کرو، ورنہ انہیں غلطی کا احساس ہوگیا تو وہ پھر لوٹیں گے۔ بہرحال جس طرح طائف کا دن حضورؐ کے لئے شخصی اور انفرادی سطح پر TURNING POINT تھا، اسی طرح غزوۂ خندق مسلمانوں کی جماعت کے لئے TURNING POINT تھا۔ اس میں تین قوّتیں مجتمع تھیں۔ قریش کی بھرپور طاقت، یہود کی مکمّل طاقت جو مدینے میں تھے، مگر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ (اب سارے واقعات میں آپ کو نہیں سنا سکتا۔ بہرحال انہیں

اُن کی بدعہدی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیا گیا!) اُدھر سے نجد کی طرف کے قبائل یعنی اہلِ عرب کی پوری طاقت مجتمع ہو گئی تھی۔ آگ لگائی گئی، جذبات ابھارے گئے اور بارہ ہزار کے لشکرِ جرّار نے مدینے کو آکر گھیر لیا۔ یہ چھوٹا سا لشکر معلوم ہوتا ہے مگر اُس وقت کے اعتبار سے سوچیے تو بہت بڑا لشکر تھا۔ دامنِ اُحد میں کل تین ہزار ہی تو آئے تھے اور اب بارہ ہزار:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ..... ۝

یعنی اے مسلمانو! یاد کرو جب احزاب، لشکر پر لشکر آرہے تھے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی آرہے تھے۔ (مدینہ حجاز کا شہر ہے، اس کے دائیں طرف کا علاقہ اونچا ہے۔ جسے نجد کا علاقہ کہتے ہیں۔ اُدھر سے جو لشکر آرہے تھے اُن کے متعلق کہا "مِّنْ فَوْقِكُمْ" اور ساحل کی طرف ڈھلوان ہے، اُدھر سے قریش چل کر آئے تھے۔ اُن کے متعلق کہا کہ: "مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" کہ وہ نیچے سے آرہے تھے۔ شمال سے یہود آئے اور انہوں نے گھیرے میں لے لیا!) اور جب نگاہیں پتھرانے لگیں اور دل اُچھل کر ہنسلیوں میں آپھنسے اور تمھیں طرح طرح کے خیال آنے لگے، اللہ کے بارے میں اس وقت امتحان ہو گیا اہلِ ایمان کا، جانچے گئے، پرکھے گئے کہ کون کتنے پانی میں ہے، اُن کے اندر واقعۃً کتنا ایمان ہے، کون جھوٹ موٹ کا عاشقِ رسول بنا ہوا تھا، اور کون واقعۃً تن من دھن کی قربانی کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ یہ اصل میں امتحان، آزمائش و ابتلا تھا۔

ایسی خوفناک صورتِ حال ہو گئی تھی کہ محسوس یہی ہوتا تھا کہ THIS IS THE END۔ کس کس کا مقابلہ کریں گے۔ چھوٹی سی بستی ہے، مارِ آستیں بنو قریظہ موجود ہیں، کسی بھی وقت وہ پیچھے سے خنجر گھونپ سکتے ہیں، ادھر لشکر پڑا ہوا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ جس طرح غزوۂ اُحد میں مشورہ ہوا تھا، اسی پر یہاں بھی عمل ہوا۔ بہرحال خندق کھودی جا رہی ہے، سنگلاخ زمین ہے، سردی کا شدید موسم ہے، کھانے کو کچھ نہیں ہے، باغات

سارے اُن کے قبضے میں آچکے ہیں، چاروں طرف سے تو BLOCKADE ہے۔ کھانے کو کہاں سے آئے گا، فاقہ پر فاقہ ہے، لوگوں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ LITERALLY یا محاورۃً نہیں۔ واقعۃً ایسا ہی ہے تاکہ نقاہت کی وجہ سے کمر دوہری نہ ہو جائے۔ اس حال میں کھدائی کر رہے ہیں مگر زبانوں پر یہ ترانہ ہے ؎

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا ۔ عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا ط

(ہم ہیں وہ لوگ جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے!) بیعت کس بات پر کی ہے: عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا ط (ہم نے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم ہیں، جب تک جان میں جان ہے!) — اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ — فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ ط (اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے، عیش تو بس آخرت کا عیش ہے!) اور حضورؐ فرما رہے ہیں: (اے اللہ! مغفرت فرما انصار کی بھی اور مہاجرین کی بھی!) — بھاری بھاری پتھر اٹھا کر آپؐ بھی دوسروں کے ساتھ باہر پھینک رہے ہیں۔ یہ نقشہ نہیں ہے کہ کہیں خیمے میں گاؤ تکیہ ہے اور وہاں بیٹھے ہوں۔ بالکل عام مسلمانوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ اور جب کچھ لوگوں نے آکر اپنا کرتا اُٹھایا اور دکھایا کہ حضورؐ! ہم نے فاقہ کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں، تو حضورؐ اپنا کرتہ اُٹھا کر دکھاتے ہیں کہ وہاں بھی دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

انتہائی خطرناک و مخدوش صورت حال ہے۔ قرآن مجید نقل کرتا ہے۔ اس آزمائش کا نتیجہ کیا نکلا۔ جن کے دلوں میں روگ تھا، نفاق تھا، انہوں نے یہ کہا کہ: مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اِلَّا غُرُوْرًا ط — ہم سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے کئے تھے وہ جھوٹے نکلے، غلط ثابت ہوئے، ہمیں سبز باغ دکھایا، مروا دیا۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی مملکتیں تمہاری ہوں گی، اور ہو یہ رہا ہے کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک ہی SITUATION ہے۔ نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ جن کے دلوں میں روگ تھا، اُن کا قول یہ ہے اور جن کے دلوں میں ایمان تھا اُن کا قول یہ ہے۔ ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے اور سچّا وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے!) دونوں باتیں اپنی جگہ حق ہیں۔ حضورؐ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عرب و عجم پر تمہیں غلبہ حاصل ہوگا، اور قرآن میں یہ وعدہ بھی تھا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

یہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں جو غزوۂ بدر سے بھی پہلے نازل ہو چکی ہے۔ (مسلمانو! ہم تمہیں آزمائیں گے، خوف ہوگا، خطرہ ہوگا، بھوک اور فاقہ ہوگا، مال کا نقصان بھی ہوگا، جانی ضیاع بھی ہوگا، کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا، فصلیں اجڑیں گی، غرض سب کچھ ہوگا) اُن کی نگاہ تھی اس پر، اس لئے کہا: هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ! (کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے اور بالکل صحیح وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے) اب دیکھئے یہ ایک ہی SITUATION ہے، نتیجے دو نکل رہے ہیں، ایک ہی کتاب ہے قرآن مجید مگر: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (اس سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے!)۔ اسی طرح ایک ہی SITUATION ہے غزوۂ احزاب کی مگر نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ معلوم ہوا اصل فیصلہ کن چیز انسان کے اندر کی کیفیت ہے۔ بہرحال اب میں تفصیل میں نہیں جا سکتا، وقت ختم ہو رہا ہے۔ جتنی خوفناک صورت بنی تھی، اتنا ہی معجزانہ طور پر معاملہ ختم ہو گیا۔ اس میں حضورؐ کی تدبیر کو بھی بڑا دخل ہے، اس کی تفصیل کا اب وقت نہیں۔ لیکن آخری فیصلہ کُن چیز تائیدِ ایزدی ہے۔ ایک ایسا جھکڑ چلا ایسی آندھی آئی کہ اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، دیگیں جو چڑھی ہوئی تھیں الٹ گئیں۔ آگ پھیل گئی، خیموں میں آگ لگ گئی، ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں جو انتہائی حکیمانہ اقدامات حضورؐ نے کئے تھے وہ بھی اس کے پشت پر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفّار میں پھوٹ پڑ گئی۔ آپس میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ ایک آسمانی آفت نازل ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے خیمے اٹھائے اور چلے گئے اور فضا

ایسے صاف ہوگئی کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ امتحان لینا تھا، لے لیا۔ کون کتنے پانی میں ہے، یہ کھل گیا۔ غزوۂ خندق کے بعد حضورؐ نے فرمایا: لن یغزوکم قریش بعدعامکم ھذا ولکنکم تغزونھم! "یعنی مسلمانو! اب اس سال کے بعد قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے۔ اب تم اُن پر حملہ آور ہوگے"۔ انگریزی میں کہیں گے: "TABLES HAVE BEEN TURNED" پانسہ پلٹ گیا۔ کفر، جتنی جمعیّت اور تیاری کے ساتھ اس وقت آیا تھا، اس سے زیادہ تیاری ممکن نہیں۔ اس میں ناکامی کے بعد اب ان میں حوصلہ نہیں کہ دوبارہ اتنے اہتمام کے ساتھ آئیں۔ یہ واقعہ ۵ھ کا تھا۔ اس کا مظہر کیا ہے کہ اگلے سال ۶ھ میں حضورؐ بغرض عمرہ مکّہ مکرّمہ کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ خواب میں آپ نے دیکھا کہ عمرہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا گیا، تیار ہو جاؤ۔ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ حضورؐ ہدی کے جانور لے کر روانہ ہوئے، احرام بندھا ہوا ہے، تلواریں ہیں لیکن نیاموں میں بند، کوئی اور ساز و سامان ساتھ نہیں۔

اُدھر قریش سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ صورتِ حال معلوم ہے، آنحضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا راستہ روک نہیں سکتے۔ صورتِ حال سمجھئے اس لئے کہ اس دوران میں یہی تو نہیں ہوا کہ حضورؐ بس مدینہ منوّرہ ہی میں کام کرتے رہے ہیں۔ آس پاس دعوت پہنچ رہی ہے، قبائل میں اب آپ کے جاں نثار موجود ہیں۔ گویا کہ اب قریش ISOLATE ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ اس طرح شکست قبول کر لیں۔ آخر عرب ہیں اور عربوں میں بھی قریش۔ حضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم حدیبیہ تک پہنچ گئے۔ سلسلہ جنبانی شروع ہوئی، کیا کرنا چاہیئے۔ پہلے تو رعب ڈالا گیا، سفارتیں آئیں، ان میں سہیل بن عمرو بہت بڑے سفیر تھے بعد میں ایمان لے آئے۔ یہاں آکر تو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر وہاں جاکر خبر دیتے ہیں کہ اے قریش! میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں جو محبّت اور جو جاں نثاری کا جذبہ میں نے محمدؐ کے ساتھیوں میں دیکھا ہے محمدؐ کے لئے، وہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ صلح کر لو۔ مصالحت ہوتی ہے۔ اس سال آپ کو واپس جانا پڑے گا۔ اگلے سال آپ عمرہ کیجئے۔ اس کے

ساتھ ہی کچھ اور شرائط بھی ہیں - ہمارا اگر کوئی شخص آپ کے پاس جائے گا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا ، اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے - نبی علیہ السّلام مسکرا رہے ہیں ، شرط یہ شرط مان رہے ہیں مسلمان پیچ و تاب کھا رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم دب کے صلح کیوں کر رہے ہیں - سب سے زیادہ شدّت کے ساتھ اضطراب : اشدھم فی امر اللہ عمر کو ہے - ان کے لئے تو یہ چیز کسی درجے میں قابل قبول نہیں تھی - دوڑتے ہوئے حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا ہم حق پر نہیں ؟ یقیناً ہیں تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے ؟ وہ اللہ کے رسول ہیں - پھر حضورؐ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں ؟ حق پر ہیں ، پھر یہ دب کہ ہم صلح کیوں کر رہے ہیں ؟ - حضورؐ مسکرائے - حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں ، ———— مجھے ساری عمر اس بات کا قلق رہا کہ میں نے کچھ گستاخی کے ساتھ بات کی ، لیکن یہ گستاخی نہیں ، یہ حمیّتِ حق کا جذبہ ہے - اس کو بیان کرنے والے ، بیان کرتے وقت کچھ نمک مرچ لگاتے ہیں - دراصل ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں حضرت عمر رضؓ کی دشمنی اور بغض و عناد ہے ، وہ بھول جاتے ہیں کہ حمیّتِ حق کا یہی جذبہ حضرت علی رضؓ کے اندر بھی ہے -

ایک معاہدہ لکھا جا رہا ہے ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب ہیں حضورؐ DICTATE کروا رہے ہیں - یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور قریش کے درمیان طے پایا - قریش کا وفد کہتا ہے کہ حضورؐ ہمیں یہ قبول نہیں ہے ، آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کے الفاظ منظور نہیں ہیں - اگر ہم آپ کو رسول اللہ مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا " محمدؐ بن عبداللہ اور قریش کے مابین لکھئے " - حضورؐ فرماتے ہیں - علیؓ ! رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو - حضرت علی رضؓ عرض کرتے ہیں : حضورؐ ! میں تو نہیں مٹاتا - حضورؐ پوچھتے ہیں کہاں لکھا ہے اور اسے خود اپنے ہاتھ سے مٹاتے ہیں - تو اگر کہنے کو آئیں تو یہ تو معصیت ہو گئی ، حضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی ہو گئی - نمک مرچ لگائیے تو کہاں تک بات جائے گی - حالانکہ نہ وہ گستاخی ہے نہ یہ معصیت ہے - دونوں میں درحقیقت حمیّتِ حق

ہے۔ مطلب یہ کہ میں اپنے قلم سے نہیں مٹا سکتا۔ یہاں محمدؐ رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ آپ اپنے ہاتھ سے مٹا دیجئے۔ اسی ارادے اور اسی جذبے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں۔ اور صورتِ حال دیکھئے، اسی وقت سہیل بن عمرو کے صاحبزادے آجاتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور سخت لاغر ہیں، کسی طرح بچ کر آگئے اور کہا حضورؐ! مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔ انہوں نے میرا جو حشر کیا ہے وہ دیکھ لیجئے۔ سب مسلمان اُن کی حالت کو دیکھ رہے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں، معاہدہ ہو چکا ہے تمھیں واپس جانا ہوگا۔ مسلمانوں کے دلوں پر جو بیت رہی ہے اس کا اندازہ کر لیجئے۔ اس معاہدے کو قرآن مجید نے "فتحِ مُبین" قرار دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (اے محمدؐ! ہم نے تو آپ کو کھلی فتح عطا کی) اور وہ کھلی فتح ثابت ہو گئی۔ ہر اعتبار سے یہ معاہدہ حضورؐ کے حق میں پڑا اور مسلمانوں کے متعلق HOSTILITIES ختم ہو گئیں۔ حضورؐ کے گویا ہاتھ کھل گئے۔ دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں عروج پہ پہنچ گئیں۔ پورے عرب میں جنگ نہیں، امن ہے۔

حضورؐ کے پاس اصل مسخر کرنے والی قوت قرآن مجید اور اس کی دعوت تھی۔ ع: "جو دلوں کو فتح کرتے وہی فاتحِ زمانہ!" تلوار دل کو فتح نہیں کیا کرتی، دل کو فتح کرتا ہے قرآن مجید! یہ جنگوں کا سارا معاملہ ایسا چل رہا تھا کہ ادھر کما حقہٗ توجہ نہیں ہو رہی تھی۔ ہر وقت جنگ، ہر وقت خطرے کی حالت اب جو موقع ملا ہے تو بیرونی اور اندرونی دونوں سطحوں پر دعوت و تبلیغ کا عمل پوری شدت سے شروع ہو گیا۔ اصحابِ صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی، اُس میں سے پچاس کو اِدھر بھیج دیا، سو کو اُدھر بھیج دیا، ستر کو ادھر بھیج دیا۔ اُن میں بیچارے وہ بھی تھے جن کو شہید کر دیا گیا۔ دھوکے سے لوگ لے جاتے تھے کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ بھیجئے جو قرآن پڑھائیں، سکھائیں اور پھر کہیں گھاٹی میں لے جا کر شہید کر دیا۔ بیر معونہ کے واقعہ میں ستر اصحابِ صُفّہ میں سے شاید ایک بچ سکا۔ لیکن اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ دعوتی عمل پوری شدت کے ساتھ شروع ہو

چکا ہے۔ دل فتح ہو رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھی تو قریش سمجھ گئے کہ ہمارے تو ہاتھ بندھ گئے۔ وہ شق بھی ان کے خلاف پڑی۔ یہاں سے کوئی مسلمان ان کی اسیری سے نکل بھاگتا تھا تو مدینے کو نہیں جاتا تھا کہ واپس کر دیں گے۔ انہوں نے اپنا ایک اڈہ بنا لیا اُس تجارتی شاہراہ پر سڑک کے عین کنارے پر جو ساحلِ سمندر کے قریب سے گزرتی تھی اور چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اس معاہدہ کے پابند نہیں تھے جو قریش نے حضورؐ سے کیا۔ اگر وہ مدینہ میں آتے تو حضورؐ انہیں واپس کر دیتے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ آپ ان کو اپنے پاس بلا لیں مدینہ میں۔ ہم معاہدے کی اس شق کو خود ہی واپس لیتے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ صلح اُلٹی ان پر پڑ رہی ہے۔ طیش میں آکر اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ یعنی جو قبیلہ مسلمانوں کا حلیف تھا اس پر حملہ کیا قریش کے حلیف قبیلے نے اور قریش کے سردار بھیس بدل کر اس میں شریک ہوئے اور تلواریں چلائیں۔ مسلمانوں کا حلیف قبیلہ حضورؐ کے پاس گیا اور فریاد کی۔ حضورؐ نے سفارت بھیجی کہ نقصان کی تلافی کرو اور قاتلین کو ہمارے حوالے کرو ورنہ معاہدہ ختم ہوتا ہے۔ جوش میں آکر انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے معاہدہ ختم۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔

ذرا نوٹ کیجئے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس بات کے منتظر تھے کہ اُن کی طرف سے خلاف ورزی ہو اور آپ اس OPPORTUNITY کو SEIZE کریں۔ اس موقع کو ایسی مضبوطی سے پکڑا کہ قریش پر فوراً یہ احساس طاری ہوا کہ ہم نے غلطی کی، ہم مارے گئے، صلح کی تجدید ہونی چاہیئے، غلطی ہوگئی۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے، یہ کیا کر بیٹھے۔ اب ابوسفیان آئے ہیں صلح کی تجدید کرنے کے لئے۔ اب حضورؐ نہیں کر رہے۔ دیکھئے! ایک یا دو سال پہلے حضورؐ نے بظاہر گر کر صلح کی۔ اب حضورؐ صلح نہیں کر رہے، کیوں؟ ذہن میں رکھئے۔ اب کفر کو صلح کر کے خواہ مخواہ ایک :— FRESH LEASE OF EXISTANCE دینا ہے۔ قوت ان کی ٹوٹ چکی ہے، تخاصمت اب ان میں موجود نہیں، مقابلہ کر نہیں سکتے تو اب صلح کی ڈھال انہیں کاہے کو دی جائے۔ اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ اصل مقصد تو

وہ ہے - اس میں تاخیر کس لئے - معلوم ہوا کہ اصل نہ صلح ہے نہ جنگ - اصل چیز ہے مقصد : لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ - یہاں تک دلچسپ واقعات آئے ہیں - اس ضمن میں کہ حضرت ابوسفیانؓ - بہرحال صحابی ہیں، بعد میں ایمان لے آئے ان کا نام ادب سے لینا ہوتا ہے - مدینے اس کوشش میں آئے کہ صلح کی تجدید ہو جائے، اپنی صاحبزادی کے گھر پہنچے، یعنی اُمّ حبیبہ کے گھر جو حضورؐ کی زوجہ محترمہ اور اُمّ المؤمنین ہیں - آج کل بھی آپ کو معلوم ہے، کسی بڑے آدمی یا افسر کو APPROACH کرنی ہو تو اندرونِ خانہ کا راستہ اگر موجود ہو تو اس سے زیادہ مؤثر راستہ اور کوئی نہیں - یہ بڑی اُمیدیں لے کر گئے ہوں گے - وہاں عجیب واقعہ پیش آیا، گھر میں پہنچے، حضورؐ کا بستر بچھا ہوا تھا، اُس پہ بیٹھنے لگے، بیٹی نے کہا : ذرا ٹھہریئے ابّا جان! بستر لپیٹ دیا - اب بیٹھے - یہ عرب کا سیاسی سردار، مدبّر، حرب کا بیٹا جو قریش کا رئیس رہا - اس نے کہا، یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس کے لائق نہ تھا؟ اب ذرا جواب دیکھئے - حضرت اُمّ حبیبہؓ نے کہا : آپ اس کے لائق نہیں ہیں - یہ بستر محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ہے - اب وہ کیا سفارش کرواتے، وہاں سے نکلے - مسجدِ نبویؐ کے پاس کچھ درویش صحابہ بیٹھے ہوئے تھے - انہوں نے ابوسفیان پہ کوئی فقرہ چست کر دیا، حضرت ابوبکرؓ پاس سے گزر رہے تھے - حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں سمجھایا کہ آخر قریش کا سردار ہے، ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے - اُن کی آپس میں کچھ تلخ کلامی ہو گئی - انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی کچھ جواب دے دیا، آخر درویش تھے - حضرت ابوبکرؓ نے جا کر حضورؐ سے شکایت کی - حضورؐ نے کیا فرمایا : ابوبکرؓ! کہیں ان کو ناراض تو نہیں کر دیا - یہ وہ لوگ ہیں کہ جن سے یہ ناراض ہو جائیں ان سے اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے ؎

اِن درویشوں میں ابوذرؓ ہوں گے، سلمان فارسیؓ ہوں گے - درویشوں کا یہ وقار تھا - بہرحال صلح نہیں ہوئی - آپؐ نے ۸ھ میں فیصلہ کن اقدام فرمایا - اب دس ہزار کی جماعت ہے اور محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کل آٹھ برس بعد فاتح کی حیثیت سے مکّے میں داخل ہوئے، انقلاب آ گیا - معمولی سی جھڑپ کہیں کہیں

ہوئی ہے، بالکل معمولی سی، ورنہ قریش کو معلوم تھا کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں۔۔۔ صورتِ حال تبدیل ہو گئی، فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں۔ یہ وقت ہے گردنوں کے اکڑنے اور سینوں کے تننے کا۔ مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن اتنی جھکی ہوئی ہے کہ جس سواری پر بیٹھے ہیں اُس کی گردن سے آپ کی پیشانی مَس کر رہی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا: وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ۔ کہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں تو جھک کے داخل ہوں، اس وقت غرور نہ ہو، استکبار نہ ہو۔ یہاں اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ معافی کا اعلان عام ہو گیا کہ جو اپنے گھر میں رہے اسے بھی معاف، جو خانہ کعبہ میں آجائے اُسے بھی پناہ مل گئی۔ سب سے بڑا دشمن رہا تھا ابوسفیان۔ فرمایا! جو شخص اس کے گھر میں چلا جائے اُسے بھی امان! اور پھر جب سب سردارانِ قریش گردن جھکائے سامنے آئے ہیں تو پوچھا: تمھیں معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کروں گا؟ اُن کا جواب انتہائی خوشامدانہ جواب تھا جو کسی عرب کی زبان پر آسکتا ہے کہ: خیرًا، اخ کریم وابن اخ کریم۔ اور حضورؐ کا جواب یہ ہے کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی کہ:۔ "لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔۔۔۔ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ" جاؤ تم سب آزاد ہو۔ یہ ہے رمضان ۸ھ میں مکّے کا فتح ہو جانا۔ گویا کہ اندرونِ عرب کامیابی کی علامت اور SYMBOL۔

لیکن کفر کی ایک آخری کوشش اور ہوئی۔ غیر قریش عرب قبائل نے مجموعی طور پر ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ کسی طرح اس سیلاب کو روکا جائے۔ یہ تھے ثقیف، طائف، اور ہوازن کے لوگ۔ بنی ہوازن بڑے تیرانداز تھے۔ چنانچہ اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں غزوۂ حُنین پیش آگیا۔ حضورؐ کے ساتھ اب بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ دس ہزار مدینے سے آئے تھے اور دو ہزار مکّے سے شامل ہوئے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی ایمان نہیں لائے مگر ساتھ شامل ہیں مقابلہ ہوتا ہے۔ تیروں کی ایک بوچھاڑ ایسی آئی کہ بھگدڑ مچ گئی۔ اگرچہ روایات مختلف ہیں اور کچھ دشمنانِ صحابہؓ نے اس کو EXAGGERATE بھی کیا ہے تاکہ اُن

سے لوگوں کو بدظن کیا جائے اور کہا جاتا ہے کہ دو آدمی رہ گئے، تین رہ گئے، چھ رہ گئے۔ یہ غلط ہے، یہ ضرور ہے کہ لشکر میں بھگدڑ مچی ہے لیکن کئی سو ساتھی حضورؐ کے ساتھ تھے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سواری سے اترے، عَلَم ہاتھ میں لیا۔ حضورؐ کی ذاتی شجاعت کا سب سے بڑا اظہار یہاں ہوا۔ آپؐ یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے: آنا النبیّ لاکذب - انا ابن عبدالمطلب۔ پھر آپؐ نے آوازیں دیں: یا اهل الشجرة! الیّ عباد الله (اے بیعتِ شجرہ، بیعتِ رضوان کرنے والو! میری طرف پلٹ آؤ!) اللہ تعالیٰ نے فتح دی۔ قرآن مجید میں سورۂ توبہ میں اس کا ذکر آیا ہے: وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ: "اس حنین کے دن کو یاد کرو جب تمھیں اپنی کثرتِ تعداد کا کچھ غرّہ ہو گیا تھا!" (بارہ ہزار ہیں ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً پکڑا) "زمین تم پر اپنی تمام وسعتوں کے باوصف تنگ ہو گئی!" مومن کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، اسباب و وسائل پر نہیں۔ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ۔ سارا ساز و سامان تیار کرو۔ لیکن بھروسہ صرف اللہ پر ہو۔

غزوۂ حنین کا صرف ایک واقعہ سنا کر میں اس کو ختم کر رہا ہوں۔ چند منٹ مجھے دیجیے، بڑا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی تقسیم کے وقت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّے کے نئے ایمان لانے والوں کو ذرا زیادہ دیا تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو جو قرآن کا بیان کردہ مصرف ہے۔ لیکن اب دیکھئے، صورتِ حال کیسی پیدا ہوتی ہے۔ منافقین کا ELEMENT تو موجود تھا۔ عجیب انداز میں کہا گیا۔ جب خون دینے اور جانیں دینے کا وقت تھا تو ہم یاد آتے تھے، انصار، اور اب بانٹنے کا وقت آیا تو اپنے گھر والے، اپنے خاندان والے، اپنے قبیلے والے یاد آگئے۔ اب اس اعتبار سے تو یہ بات غلط نہیں کہ اس وقت جو مولفۃ القلوب تھے، وہ مکّے کے لوگ تھے، حضورؐ کے قبیلے کے لوگ تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، حضورؐ کو بھی خبریں پہنچ رہی ہیں۔ دیکھئے! حضورؐ نے کیا کیا۔ کیسی نازک صورتِ حال ہے اور کس طرح اسے HANDLE کیا ہے۔ ایک بڑا خیمہ لگوایا اور انصار کو جمع کیا، انصار آگئے

حضورؐ نے خطبہ دیا۔ دیکھیے! خطباتِ نبویؐ میں سے CLIMAX یہی خطبہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اے اہلِ یثرب! کیا یہ درست نہیں کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ انہوں نے کہا: "بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؐ!" کیا یہ درست نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمھیں ایک بنا دیا۔ تمھارے دلوں میں محبت پیدا کر دی۔ انھوں نے کہا: "بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؐ!"۔ اِن باتوں کا تو انکار ممکن ہی نہیں۔ حضورؐ نے وہ سارے احسانات گنوائے جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی وساطت سے انصار پر کیے اور آپؐ نے بات کو پلٹا۔ ہاں اے اہلِ یثرب! تم یہ کہو کہ اے محمدؐ! (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تمھیں کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا، ہم نے پناہ دی، تمھیں تمھاری قوم نے نکال دیا تھا۔ ہم نے اپنے اہل و عیال سے بڑھ کر تمھاری حفاظت کی۔ میں کہوں گا، تم درست کہتے ہو، تو اے معشرِ انصار! کیا تمھیں یہ بات نہیں پسند کہ لوگ بھیڑیں، بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔ سب کی چیخیں نکل گئیں، سب پکار اُٹھے: "رَضِیْنَا، رَضِیْنَا" (ہم راضی ہیں، ہم راضی ہیں!) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

رَضِیْنَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا ؛ لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْجُهَّالِ مَالٌ

(ہم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمیں علم عطا فرمایا اور جاہلوں کو دولت عطا فرمائی!)

بہرحال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قدم پر مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا، ایک حل ہوا تو دوسرا آ رہا ہے، دوسرا حل ہوا تو تیسرا آ رہا ہے۔ اپنوں کی طرف سے بھی ہے اور اغیار کی طرف سے بھی ہے۔ منافقین بہرحال قانوناً تو اپنے تھے، مسلمان تھے، کلمہ گو تھے۔ بہرصورت فتحِ مکّہ کے بعد اب تین باتیں ہوئیں۔ حضورؐ نے حکمت یہ اختیار فرمائی کہ پہلا حج جو آیا وہ مشرکین کے زیرِ اہتمام رہنے دیا۔ مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر حج کیا۔ لیکن اگلے سال آپؐ نے انتظام مشرکین کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور امیرِ حج ابوبکر صدیق رضؓ کو بنا کر بھیجا، قافلہ مدینے سے آیا، حضورؐ خود تشریف نہیں لائے۔ اس کے بعد سورۂ توبہ کی جو آیات نازل ہو گئیں وہ اعلانِ

براءت ہے مشرکین سے، انہیں صرف اَشْهُرِ حُرُم کی مہلت دی جا رہی ہے۔ اس عرصے میں ایمان لے آئیں تو عافیت ہے۔ اگر اپنے شرک و کفر پہ اڑے رہیں تو ان کا قتلِ عام شروع ہو جائے، وہ کیوں؟ وہ بات جو میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں جس قوم پہ رسول کی بعثت کی حُجّت قائم ہو چکی ہو، اب اس کے لئے رعایت نہیں۔ جس ضابطے کے تحت قومِ نوحؑ، قومِ ہود، قومِ صالح ہلاک ہوئی ہیں، وہ ضابطہ اب لاگو ہو رہا ہے اہلِ عرب پر:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؕ

تو اگر آلِ فرعون غرق کئے گئے ہیں تو تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا یا ایمان لے آؤ ـــــ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ عذابِ خداوندی کی صورتیں بدل سکتی ہیں۔ کبھی وہ زمین میں زلزلے کی شکل میں آ سکتا ہے، کبھی وہ آسمان سے بارش اور طوفان کی صورت میں آ سکتا ہے اور کبھی مسلمانوں کی تلواروں کی صورت میں آ سکتا ہے۔ یہ اعلان حضرت علیؓ نے حضورؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حج کے موقع پہ کر دیا۔ یہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد یوں سمجھئے کہ جزیرہ نمائے عرب میں MOPPING UP OPERATION ہوا۔ سب ایمان لے آئے اور قرآن کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ جاہ کفر اور شرک کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو تارکِ وطن ہو کر چلے گئے۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکّے سے نکلے تھے توحید کے لئے، مگر ابوجہل کے صاحبزادے عکرمہ نکلے شرک کے لئے، غیرت سے نہیں مانا کہ ایمان لے آئیں۔ مغلوب ہو گئے مگر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن عجیب واقعہ ہوا، حبشہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں طوفان آیا۔ جس کشتی میں سوار تھے، ڈولنے لگی۔ سب لوگوں نے اللہ کو پکارنا شروع کیا۔ وہ خود کہتے ہیں میں نے سوچا کہ اسی کی دعوت تو محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیتے ہیں۔ کسی لات، کسی ہبل، کسی عزّیٰ کو کوئی نہیں پکار رہا۔ خطرے کے وقت پکار رہا ہے تو اللہ کو پکار رہا ہے۔ لہٰذا واپس آئے اور ایمان لے آئے۔ بہرحال اس ایک سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب

کا صفایا ہو گیا۔ اُسے شرک اور کُفر سے پاک کر دیا گیا، اگلے سال سے حجۃ الوداع، حضورؐ تشریف لائے، بہ نفسِ نفیس حج ادا کیا۔ سوا لاکھ یا ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان، عرب کی سرزمین سے جمع ہیں۔ آخری خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد کُل اسّی یا نوّے دن حضورؐ کی حیاتِ دُنیوی کے ہیں :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ٥ ــــــ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ٥

سارے مراحل طے ہو گئے۔ خطبہ دیا اور آخر میں لوگوں سے سوال کیا "اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ (لوگو! کیا میں نے پہنچا دیا؟) اور صحابہؓ نے جواب دیا : اِنَّا نَشْھَدُ اِنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ (ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِّ تبلیغ بھی ادا کر دیا! حقِّ نصیحت بھی ادا کر دیا، حقِّ امانت بھی ادا کر دیا۔) کہیں یہ الفاظ ہیں کہ : اِنَّکَ اَدَّیْتَ الْاَمَانَۃ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃ ۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا :۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَد ، اَللّٰھُمَّ اشْھَد ، اَللّٰھُمَّ اشْھَد (اے اللہ تو بھی گواہ رہ! تین بار فرمایا) کہ وہ بھاری بوجھ جو بلفحوائے الفاظِ قرآنی : اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ؕ میرے کاندھوں پر تھا اُتر گیا۔

حضرات! جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دونوں کام پورے ہو گئے۔ اہلِ عرب تک تبلیغ کا حق بھی ادا ہو گیا اور جزیرہ نمائے عرب تک : لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ بھی ہو گیا۔ محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرضِ منصبی کا ایک PHASE تکمیل کو پہنچا۔ لیکن آپؐ صرف عرب کے لئے رسول بن کر نہیں آئے۔ آپؐ سے ختمِ نبوّت کا وہ حصّہ جو : وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا یا : وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ٥ کی رُو سے آپ پر لازم آتا تھا۔ یعنی بعثتِ نبویؐ کا بین الاقوامی یا عالمی پہلو ابھی میری آج کی گفتگو میں باقی رہ گیا ہے۔ بات طویل ہو رہی ہے۔ مَیں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ نامعلوم مَیں کن کن چیزوں کو چھوڑ کر نکلا ہوں۔ ہر جگہ خیال ہوتا تھا یہ بات ضرور بیان کرنے کی ہے، لیکن وقت نہیں ہے بات آج بھی نامکمّل رہی ہے۔ بعثتِ نبویؐ کا جو بین الاقوامی پہلو ہے وہ اِن شاء اللہ اب آئندہ تقریر میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ـــــ ختم

سلسلہ تقاریر سیرت - ۵

اسرار احمد

خلافتِ صدیقیؓ اور انقلابِ نبویؐ کا استحکام

خطبۂ مسنونہ کے بعد۔ فقد قال اللہ تعالیٰ: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" وقال فی موضعٍ اٰخر: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ صدق اللہ العظیم ۔ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ - اٰمین یا ربَّ العالمین

سیرت النبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور امّتِ مسلمہ کی تاریخ کے سلسلے میں چند تقاریر کا جو پروگرام چل رہا ہے، اس میں ہم متعدد اسباب کی بنیاد پر اپنے شیڈیول (SCHE-DULE-) سے خاصے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ایک تو تقریروں کا نمبر اندازے سے بڑھ رہا ہے۔ اور کل کا ایک سانحہ ہو گیا ہے۔ بہرحال جیسے بھی اللہ کو منظور ہو گا، اسے ہم پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ پہلی دو تقریریں اصولی مباحث پر مشتمل تھیں۔ (۱) بعثتِ انبیاء کا عمومی مقصد کیا ہے اور (۲) خاتم النبیّن، آخر المرسلین، سیّد الانبیاء اور افضل المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کی بنیادی کیفیات کیا ہیں۔ پھر اس کے پس منظر میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا جو کارنامۂ حیات ہے، اسے صحیح طور پر ASSESS کیا جا سکتا ہے۔ تین باتیں آپ کے ذہن میں ہوں گی کہ ختمِ نبوّت کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ ہدایتِ اپنے تکمیلی مراحل کو پہنچ گئی، الہُدیٰ کی صورت میں یا بالفاظِ دگر قرآن حکیم کی صورت میں آسمانی ہدایت ہمیشہ ہمیش کے لئے، ابد الآباد تک کے لئے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی اور اس کی حفاظت

کا اللہ نے ذمہ لے لیا ہے۔ قرآن مجید سے متعلق اِن دونوں اُمور کا براہِ راست تعلق ختمِ نبوّت سے ہے۔ ختمِ نبوّت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ایک مکمّل دین اور ایک مکمّل نظامِ زندگی عطا کیا گیا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے جتنے گوشے، جتنے پہلو ہیں، اور اس میں گوناگوں قسم کی جو پیچیدگیاں، تمدّن و تہذیب اور ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل کے دوران پیدا ہوتی چلی گئیں۔ ان سب کا ایک متوازن اور معتدل حل، ایک نظامِ عدل و قسط، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دینِ حق کی شکل میں دے دیا گیا، اور آپ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ اس نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیا جائے تاکہ بنی نوعِ انسان پر حجّت صرف اس اعتبار ہی سے قائم نہ ہو کہ ہدایتِ خداوندی، انفرادی زندگی سے متعلق ہے اور انفرادی سیرت و کردار کا جو معاملہ ہے، صرف اس کے ضمن میں کامل ہدایت ملی ہے۔ بلکہ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجّت اس صورت میں بھی ہو جائے کہ نظامِ اجتماعی سے متعلق بھی جو ہدایت دی گئی، اس کا بھی ایک عملی نمونہ دُنیا میں قائم کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ وہ کوئی UTOPIA نہیں ہے، وہ کوئی صرف نظری تعلیم نہیں ہے کہ جو قابلِ عمل نہ ہو بلکہ وہ قابلِ عمل ہے، وہ دنیا میں قائم ہوا ہے اور بڑے وسیع و عریض خطّے پر قائم ہوا ہے، اور وہ چلا ہے اور اس کی برکات کا دُنیا نے بچشمِ سر مشاہدہ کیا ہے۔

تیسرا پہلو ختمِ نبوّت کا وہ ہے، جس کے لئے مَیں نے آج دو آیتیں پڑھیں کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پہلے اور آخری نبی و رسول ہیں، جن کی بعثت علی الاطلاق پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ آپ سے پہلے کسی نبی اور رسول کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے نہیں تھی۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ انسانی تمدّن، ذرائع رسل و رسائل، حمل و نقل کے وسائل ابھی اتنے تھے ہی نہیں کہ کسی ایک دعوت پر بنی نوعِ انسان کو مجتمع کیا جا سکتا۔ لہٰذا نبوّتیں REGIONAL بھی تھیں اور موقّت بھی تھیں۔ ایک علاقے میں ایک نبی آئے، انہوں نے دعوت دی، قوم سے بایں الفاظ خطاب کیا: "یَا قَوْمِ، یَا قَوْمِ!"۔ حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ، حضرت صالح ہوں، یا حضرت شعیبؑ، قرآن میں بار بار ذکر آتا ہے: یَا قَوْمِ، یَا قَوْمِ! (اے میری قوم کے لوگو!) اس کے بعد بہت سے رسول آئے، یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متّصلاً قبل حضرت مسیح علیہ السّلام تشریف لائے۔ حضرت مسیحؑ اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان تقریباً چھ صدیوں کا وقفہ ہے، اور یہ وقفہ نبوّت و رسالت کا وقفہ ہے، اسے فترۃِ اُولیٰ کہہ لیں۔ اِن چھ صدیوں میں نبوّت کا دروازہ بند رہا ہے اور پھر ایک دفعہ کھُل کر ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ اس لئے اس کو فترۃِ اُولیٰ کہتے ہیں۔ آخری فترۃ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی ـــــ اور اس سے پہلے تمہیداً چھ سو برس ایسے بھی گذرے ہیں کہ پورے کُرّۂ ارضی پہ کوئی نبی اور رسول نہیں حضرت مسیح علیہ السّلام کے بارے میں ایک مغالطہ ہو سکتا ہے، اس لئے کہ عیسائیت جیسے کہ دنیا میں آج موجود ہے، بین الاقوامی مذہب بن گیا ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السّلام کی بعثت کسی خاص قوم کی طرف نہیں تھی اس مغالطے کی اصلاح کر لیجئے۔ قرآن مجید تعیّن کے ساتھ کہتا ہے کہ "رسولاً الیٰ بنی اسرائیل" کہ حضرت مسیح علیہ السّلام رسول تھے صرف بنی اسرائیل کی طرف اور لُطف یہ ہے کہ یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں :

"مَیں بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!"

یہ الفاظ ابھی تک موجود ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السّلام نے جب اپنے حواریّین کو تبلیغ کے لئے بھیجا ہے تو اس وقت انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، بڑا پیارا خطبہ ہے، کچھ ہدایات دی ہیں، اگرچہ وہ میرے موضوع سے متعلق نہیں ہیں، مگر مَیں نہیں چاہتا کہ آپکو نہ سُناؤں ـــ بڑا پیارا جُملہ ہے :

"تم نے مفت پایا ہے، مفت تقسیم کرو، مَیں نے تم سے کوئی اُجرت نہیں لی تم بھی اپنی دعوت و تبلیغ کی کسی سے اُجرت وصول نہیں کروگے!"

ساتھ ہی واضح طور پر ممانعت کر دی ہے، بلکہ وہاں ایک تشبیہ ہے جو ویسے تو کچھ گراں گذرتی ہے کہ کوئی شخص اپنے بچّوں کی روٹی کُتّوں کے آگے نہیں ڈالا کرتا۔ میرے پاس ایک پیغام ہے جو صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے، لہٰذا یہ دعوت صرف اُن تک محدود ہے! یہ دراصل سینٹ پال تھا، جس نے دینِ عیسوی میں جو مسیح علیہ السّلام کا اصل دین تھا، جہاں اور تغیّر و تبدّل کیا ہے، یہ تبدیلی بھی اُسی نے پیدا کی ہے۔ ورنہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اس مقدّس گروہِ انبیاء و رسل میں پہلے اور آخری نبی و رسول ہیں کہ جن کی بعثت پوری

نوعِ انسانی کی طرف علی الاطلاق ہوئی :

"وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" اور "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝"

اور ایک خطبے میں آپ نے اس کی وضاحت کی ہے ، یہ خطبہ "نہج البلاغہ" میں ہے۔ یہ خطبہ نبی علیہ السّلام کا ہے اور معلوم ہوتا ہے یہ بالکل ابتدائی دَور کے خطبات میں سے ہے۔ الفاظ یہ ہیں : " انّی لرسول اللہ الیکم خاصّة والی النّاس کافّة !

" لوگو ! مَیں اللہ کا ایلچی ہوں پیامبر ہوں ، رسول ہوں تمھاری طرف بالخصوص (کیونکہ مخاطب اہلِ عرب ہیں) اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم !"

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ بعثتِ خصوصی کی حد تک جو ذمّہ داریاں تھیں وہ تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جیسا کہ ہم پچھلی تقریر میں دیکھ چکے ہیں ، بنفسِ نفیس مکمّل کردیں ، دونوں کام کر دیئے ، دونوں چیزیں تھیں جو دے کر بھیجے گئے ۔۔ الہُدیٰ ۔۔ قرآن حکیم ۔۔ جس کی تبلیغ پر خطبۂ حجّۃ الوداع کے دوران گواہی لے لی۔ چنانچہ آپؐ نے پوچھا : الا ھل بلّغت ؟ (لوگو ! کیا مَیں نے پہنچا دیا یا نہیں ؟) اور جواب لے لیا۔ آپ نے یہ عمل تین مرتبہ دُہرایا ، کیونکہ عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ بات کو تین بار دُہرایا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا ، مجمع بہت بڑا تھا۔ ایک دفعہ دائیں طرف رُخ کرکے بات کی ہے ، ایک دفعہ سامنے رُخ کرکے بات کی ہے ، اور ایک دفعہ بائیں طرف رُخ کرکے بات کی ہے۔ تو عقلاً اور منطقی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تین مرتبہ آپ نے کہلوایا ہے :۔۔۔۔ انّا نشھد انّك قد بلّغت وادّیت ونصحت ! (ہاں حضور ! ہم گواہ ہیں آپ نے حقِّ تبلیغ ادا کردیا ، حقِّ نصیحت ادا کردیا ، حقِّ خیرخواہی اور حقِّ امانت ادا کردیا !) ۔ آپ نے تین مرتبہ فرمایا : " اللّٰھم اشھد ، اللّٰھمّ اشھد ، اللّٰھمّ اشھد ! (کہ اے اللہ ! تو بھی گواہ رہ) ۔۔۔۔۔ پہلی بات تو مکمّل ہوگئی۔ قرآن مجید میرے پاس امانت تھا ، مَیں نے تم تک پہنچا دیا ، اب تمھارے پاس امانت ہے ، تم اسے پوری نوعِ انسانی تک پہنچاؤ !" کس قدر جامع کلمہ ہے : " فلیبلغ الشاھد الغائب !" کہ اب جو لوگ یہاں ہیں وہ اُن تک پہنچائیں ، جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اس غائب میں وہ بھی آگئے جو اس وقت کُرّۂ ارضی پر موجود تھے ، اور وہ تمام انسان بھی آگئے جو قیامت

تک پیدا ہونے والے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب یہ امانت میرے کاندھے سے اتری اور تمہارے کاندھے پر آگئی۔

دوسرا پہلو ہے "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" ۔ اس اعتبار سے بھی ظاہر بات ہے کہ سارے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کو غالب کر دینے سے بعثتِ نبویؐ کا مقصد بہ تمام وکمال پورا نہیں ہوا، جب تک کہ پورے کُرّۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اپنے مقصدِ بعثت کے اس بین الاقوامی PHASE کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفسِ نفیس کیا، اور یہ ہے درحقیقت میری آج کی گفتگو کا موضوع۔ اس لئے کہ جس کام کا آغاز آپ نے فرمایا اور اس کی تکمیل ہوئی دورانِ خلافتِ راشدہ، تو خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا آغاز کیسے فرمایا۔ اس سے پیشتر چند منٹ لوں گا۔ پچھلی تقریر میں ایک بات رہ گئی، عرب میں جو یہود آباد تھے، اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب، صلح حدیبیہ، فتح مکّہ اور غزوۂ حنین، یہ کچھ LAND MARKS ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کے دین کا غالب ہونا، اور اس میں میں عرض کر چکا ہوں کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اعلان فرما دیا گیا، اُن آیات کا جو سورۂ توبہ کے آغاز میں ہیں:-

"بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ..... !"

کہ مشرکین کے ساتھ اب کوئی معاہدہ نہیں ہے، صرف چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے، جسے اسلام قبول کرنا ہے وہ کرلے اور جسے اپنے کفر و شرک پر اڑے رہنا ہے، وہ جہاں سینگ سمائیں چلا جائے۔ اُس کے لئے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی گنجائش نہیں ہے کھلا اعلان ہے کہ:

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ !"

کہ جب یہ محترم مہینے ختم ہو جائیں تو اے مسلمانو! قتل کرو ان مشرکوں کو، جہاں پاؤ۔ یہ معاملہ تھا بنی اسمٰعیل کے لئے، یا اہلِ عرب کے لئے، یہود کے معاملے میں ایک نرمی برتی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا آپ پہلے پوری تاریخ کو ذہن میں لائیے۔ مدینہ منوّرہ میں تشریف لاتے ہی آپ نے یہود سے معاہدے کئے۔ یہ میں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ آپ کے تدبّر

کا شاہکار ہے۔ اِس کی تاریخ اگر آپ پڑھنا چاہیں تو MONT GOMERY
کی کتاب MOHAMMAD AT MADINA WATT پڑھئے۔ آپ کو
معلوم ہوگا کہ اس شخص نے کس قدر TRIBUTES آپ کو PAY کئے ہیں۔ اسے
آپ کی دُور اندیشی اور تدبّر کا شاہکار مانا ہے۔ جانتے ہی انہیں معاہدوں میں جکڑ لیا۔
دوسری جو بات میں نے عرض کی تھی، یہ تھی کہ ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ
کر کے جو نماز پڑھی گئی، اس میں بھی حکمتِ خداوندی کارفرما تھی۔ یہود یہ سمجھے کہ یہ تو ہمارے
ہی پیرو ہیں، ہمارے قبلے کا اتباع کر رہے ہیں، لہٰذا فوری طور پر مخالفت اور اپنی تمام
قوتوں کو بروئے کار لا کر نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی دعوت کی راہ میں مزاحم ہونا
یہ نہیں ہوا، کچھ WAIT AND SEE کا سا عمل رہا ہے۔ اس میں اور پہلو بھی تھے
بہرحال جب غزوۂ بدر ہوا تو دو اعتبارات سے یہود کے کان کھڑے ہوئے۔ ایک تو اس
سے متصلاً قبل تحویل قبلہ ہو گیا۔ حکم ہوا کہ "فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ" کہ اب اپنا
رُخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو۔ کان کھڑے ہوئے کہ یہ تو بالکل نئی شریعت ہے، نیا قبلہ،
نیا مرکز، نئی اُمّت۔ دوسرے بدر کی فتح میں ان کو بھی اب پوری طرح محسوس کرا دیا۔
کہ یہ معاملہ اب ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ تین قبیلے تھے (۱) بنو قینقاع
(۲) بنو نضیر (۳) بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کا پیشہ زرگری تھا، سب سے زیادہ
امیر بھی تھے۔ لہٰذا اتفاقاً سب سے زیادہ بہادر قبیلہ بھی یہی تھا، اس لئے سب سے پہلے
انہوں نے اقدام کیا۔ غزوۂ بدر کے فوراً بعد اُن کو جو طیش آیا، ایک مسلمان خاتون کی بےحرمتی
کی۔ ایک مسلمان نے جوشِ حمیّت میں اس یہودی کو قتل کر دیا، یہودیوں نے اس انصاری
صحابی کو شہید کر دیا۔ اب معاملہ بڑھا، جس کے نتیجہ میں نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے
فوراً اقدام فرمایا۔ پندرہ دن کا محاصرہ ہوا اور اس کے بعد ان کو وہاں سے جلاوطن
کر دیا گیا۔ یہ یہود کا پہلا قبیلہ تھا جو جنگِ بدر کے فوراً بعد چلا گیا۔

غزوۂ اُحد کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بعد صورتِ حال بڑی مخدوش
ہو گئی تھی، دشمنوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے کہ ایسی کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ
بھی انسان ہی ہیں۔ اگر بدر میں ستّر مشرک مارے گئے تھے تو اُحد میں ستّر مسلمان بھی شہید
ہو گئے۔ اُن کے حوصلے جو بڑھے تو بنو نضیر نے ایک نئی حرکت کی، اور وہ تھی نبی علیہ السّلام

کو قتل کرنے کی سازش، ان کی یہی حرکت اُن کی جلاوطنی کی تمہید بن گئی۔

تیسرا قبیلہ رہ گیا بنو قریظہ کا، اُن کے ساتھ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بڑی نرمی برتی۔ انصار کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر انہوں نے بدعہدی کی۔ وہ تو یوں کہئے کہ حکمتِ خداوندی یا مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ ہی کچھ اور تھا، ورنہ SITUATION بڑی خطرناک بن چکی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر سامنے اور بنو قریظہ نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے اور محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے درمیان کوئی عہد نہیں۔ حضرت سعد بن معاذؓ جو اُن کے حلیف اور ان سے قریبی تعلق رکھنے والے تھے، وہی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے گئے تھے، وہ واپس آئے تو حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجمع عام میں نہ کہنا۔ ایسا نہ ہو مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اشارے کنائے میں بتا دیا کہ انہوں نے بدعہدی کی ہے۔ لہٰذا غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ بنو قریظہ ہوا اور بنو قریظہ کو اُن کی بدعہدی کی سزا دی گئی۔ ان کے جتنے قابل جنگ مرد تھے، ان کو قتل کر دیا گیا اور باقی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ مدینے سے یہودیوں کا استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا مرکز بنا خیبر، جو پہلے سے بھی اُن کا بہت بڑا مرکز اور گڑھ تھا۔ یہ جو قبیلے وہاں پہنچے تو اُن کی ایک جمعیت بن گئی اور وہ لگے اس مرکز سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے، ان ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے اور ان کا مرکز توڑنے کے لئے ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں حضورؐ نے خیبر پر حملہ کیا اور اسے ختم کر دیا۔ اس طرح اندرون ملک۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ایک طرف مشرکین کے استیصال سے شرک کی مکمّل بیخ کنی ہو گئی اور دوسری طرف یہودیوں کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ البتّہ ان کے ساتھ رعایت یہ برتی گئی کہ:

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

"کہ اگر یہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔!"

یہ بات ذرا سمجھنے کی ہے کہ یہ رعایت اہل عرب کو نہیں دی گئی۔ ان کے دو ہی ALTER NATIVES تھے یا اسلام قبول کرو یا قتل کر دیئے جاؤ گے۔ تیسرا

IMPLIED تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ تو چلے جاؤ، ملک میں رہ نہیں سکتے۔ لیکن یہود کو یہ رعایت دی گئی کہ اسلام کو قبول کر لو تو ہمارے بھائی، برابر کے حقدار۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو وہ چھوٹے بن کر رہیں اور جزیہ دیں تو وہ ذمّی کی حیثیت سے اسلامی مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اِس کی وجہ کیا ہے، وہ جو میری دو تقریریں تھیں، اُن میں اِس کا جواب بھی ہے۔ جس قوم کی طرف نبی کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے، جس میں وہ نبی ہوتا ہے، جس کی زبان بولتا ہوا وہ آتا ہے، اُس قوم کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ دوسری قوم کے لئے کوئی رعایت ہو سکتی ہے کہ اس کے اور اس کے درمیان کوئی حجاب طاری ہو سکتا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بفحوائے آیتِ قرآنی:

" هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ "

انہی میں سے تھے۔ لہٰذا اہل عرب پر تو اتمامِ حجّت بتمام و کمال ہو گیا۔ اُن کے لئے اب کوئی رعایت نہیں، کوئی CONCESSION نہیں، اُن کو دو ٹوک فیصلہ کرنا ہوگا یا اسلام قبول کریں، یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں، ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ یہ ہے کہ یہود کے ساتھ جو رعایت برتی گئی، اُس پر قیاس کرتے ہوئے، بعد میں دنیا کی جتنی اقوام ہیں، اُن کے ساتھ معاملہ اسی قاعدے کے تحت ہوگا۔ چنانچہ تاریخ اسلام کی یہ ایک بڑی نمایاں بات ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران جب مسلمان نکلے ہیں تو ان کی طرف سے ہمیشہ تین باتیں پیش کی گئیں۔

(i) اسلام لے آؤ تو ہمارے بھائی ہو اور تمھارے جان و مال اتنے ہی محترم ہوں گے، جتنے کسی مسلمان کے ہوتے ہیں۔

(ii) اگر اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے ہو کر رہو، اس لئے کہ فاسد اور ظالمانہ نظام انسان کو اپنے اندر جکڑ لیتا ہے، اور وہ حجاب اور پردہ بن جاتا ہے اللہ اور بندے کے مابین۔ لہٰذا اس غلط نظام کو ختم SHATTER کر دیا جائے گا۔ فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنا مذہب ترک کرے اور اسلام قبول کرے، اس کو پوری آزادی ہے۔ لیکن نظامِ اجتماعی اللہ کے دین کے سوا گوارا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے خلاف ہو جائے گا!

(iii) اور اگر یہ دونوں باتیں منظور نہیں ہیں تو تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

اب آگے چلئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے INTER NATIONAL PHASE کا آغاز کس طرح کیا۔ حکمت تبلیغ کے اعتبار سے سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے اور یہ بہت اہم بات ہے کہ یہ ممکن نہ تھا کہ جیسے ہی حضورؐ نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اسی وقت آپ قیصر کو، کسریٰ کو، مقوقس کو، نجاشی کو، خطوط بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن یہاں تدریج دیکھئے کہ جب جزیرہ نمائے عرب میں آپ نے اپنے قدم مضبوطی سے جما نہیں لئے اور صلح حدیبیہ ہو نہیں گئی۔ آپ نے اس کام کا آغاز نہیں کیا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب قریش نے حضورؐ کو تسلیم کر لیا، چاہے آپؐ نے بظاہر دب کر صلح کی۔ اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اکثر صحابہؓ حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ میں پیچ و تاب کی کیفیت تھی۔ لیکن اصل بات کہ : اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ اس اعتبار سے تھی کہ گویا قریش نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا کہ اب آپ کی ایسی حیثیت ہے کہ ہم آپ سے مصالحت کر لیں۔ چنانچہ یہ موقع ہے کہ اندرون ملک آپ کے مشن کی تکمیل کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔ اب آپ نے خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ہے حکمت تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ تیرہ برس تک حضورؐ نے اپنی تمام تر توجہ مکہ کی سرزمین پر مرکوز رکھی ہے۔ سنہ نبوی میں آپ نے طائف کا سفر کیا ہے۔ گویا کہ جب تک اہل مکہ نے آپؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا تھا، اُس وقت تک آپؐ نے مکہ سے قدم بھی باہر نہیں رکھا۔ اور اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں تمکن عطا فرمایا تو پورے چھ برس مدینہ میں جدّ و جہد ہوتی رہی ہے اور جب صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ کی طاقت کو تسلیم کر لیا گیا تو اب آپؐ کے نامہ ہائے مبارک مختلف بادشاہوں اور رؤسا کو گئے ہیں۔

آپؐ کے دعوتی خطوط اور دعوت نامے قیصر روم و کسریٰ (عظیم فارس) مقوقس (شاہ مصر) نجاشی (شاہ حبش) رؤسائے یمن، حارث غسانی (رئیس شام) اور آس پاس کے تمام حکمرانوں اور سلاطین کی طرف گئے ہیں۔ کسریٰ کی بدبختی کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ خط لے کر گئے، کسریٰ طیش میں آ گیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ وہ عربوں کو اپنی رعیت

سمجھتا تھا۔ عربوں کی اس وقت سرے سے کوئی حیثیت تھی ہی نہیں۔ اس وقت دو عظیم طاقتیں SUPER POWERS تھیں۔ ایک سلطنتِ رُوما اور دوسری سلطنتِ کسریٰ۔ عرب کے تمام زرخیز علاقے ان کے پاس تھے۔ عراق عرب پر جو بہت زرخیز ہے، ایرانیوں کا تسلّط تھا اور شام عرب پر رومیوں کا تسلّط تھا۔ باقی درمیان میں "الربع الخالی" رہ گیا۔ وہ یا تو لق و دق صحرا ہے یا حجاز کا پہاڑی علاقہ ہے۔ یمن جو زرخیز علاقہ تھا، اس پر ایران کا قبضہ تھا اور عرب کی حیثیت صرف آزاد قبائل کی سی تھی کہ ہمسایہ حکومتیں ان کے ساتھ زیادہ تعرّض نہیں کیا کرتیں۔ البتّہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قبائل ہمارے زیرِ اثر ہیں۔ چنانچہ کسریٰ کے ذہن میں بھی تھا کہ یہ تو میری رعیّت میں سے ہے۔ اس کی یہ گستاخی کہ مجھے خط لکھا۔ ؟ عرب کے قاعدے کے مطابق پہلے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نام تھا اور بعد میں شاہِ کسریٰ کا: "من محمّد رسول اللہ إلیٰ کسریٰ عظیم فارس !" ــــ اس پر وہ اس قدر طیش میں آیا کہ خط پھاڑ دیا، اور یمن کے حاکم کے نام ایک حکم بھیجا۔ (اس حاکم کا نام باذان تھا) کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل انسان کون ہے؟ اس کو فوراً گرفتار کر کے ہمارے ہاں پیش کرو۔ اس نے دو آدمی روانہ کئے جو آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ اس پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کو بتا دو کہ اسلامی حکومت اس کے دار الحکومت تک پہنچ جائے گی، اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپؐ نے رات ان ایلچیوں کو ٹھہرایا اور صبح خبر دے دی کہ جاؤ تمہارا بادشاہ مر چکا ہے، اس لئے کہ اس رات وہ قتل کر دیا گیا تھا، اور وہ خسرو پرویز کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ یہ معاملہ تو ہُوا اُن کے ساتھ۔

قیصرِ رُوم کے دربار میں حضرت دحیہ کلبیؓ گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو انتہائی خوبرو اور خوش شکل تھے، اور اُن کا ذکر خاص طور پر اس پہلو سے آتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے ــــ اگرچہ وقت لگے گا، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ جو دو عظیم سلطنتیں تھیں ان کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی سلطنتِ رُوما کا پلڑا بھاری ہوتا تھا اور کبھی کسریٰ کو پسپائی اختیار کرنا پڑتی تھی، اور کبھی ایرانی آگے بڑھتے تھے اور رومی پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اب صورت

یہ تھی کہ رومی تو عیسائی (اہل کتاب) تھے اور ایرانی آتش پرست۔ اور مکی دور میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں رُومیوں یعنی نصاریٰ (عیسائیوں) کے ساتھ ہیں، اور ایرانی، مشرکینِ مکہ سے قریب تر ہیں اور ہوا یہ کہ اُس زمانہ میں ہرقل کو جو قیصرِ روم تھا، ایرانیوں کے ہاتھوں ایک بڑی شرمناک شکست ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکوں نے گھی کے چراغ جلائے اور بغلیں بجائیں کہ دیکھو مسلمانو! تمھارے اہل کتاب پسپا ہو گئے۔ اس پر مسلمانوں کے دل بجھ گئے۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات اسی موضوع پر ہیں:

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۝

اور اس میں یہ خوشخبری بھی سنادی گئی کہ وہ مغلوب ہونے کے بعد پھر غالب ہو جائیں گے اور یہ صرف چند سالوں میں ہوگا۔ یہ ایک پیش گوئی تھی جو سچ ثابت ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مدّت پر ایک مشرک سے شرط کر لی اور اس میں مدّت کم معیّن کی۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا بِضْع کا لفظ دس سے کم کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا ۹ سال کی شرط رکھو۔ ٹھیک ۹ سال بعد یہ واقعہ ہوا کہ اِدھر مسلمانوں کو معرکۂ بدر میں فتح ہوئی اور اُدھر قیصرِ رُوم کو فتح ہوئی، اور اہل ایمان کے لئے یہ دو طرفہ خوشی تھی۔ تو اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ اس وقت بڑا جشن منایا جا رہا تھا اور ہرقل خود پا پیادہ چل کر آیا تھا، بیت المقدس میں شکرانہ ادا کرنے کے لئے یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں حضرت دحیہ کلبیؓ حضور اکرمؐ کا خط لے کر پہنچے۔ حارث غسّانی نے یہ خط قیصر کے پاس پہنچا دیا۔ اُس نے خط پڑھا، بات سمجھ میں آگئی، عیسائی تو اس بات کے منتظر تھے اور وہ بڑا عالم تھا۔ اس لئے اس کو بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی، لیکن اس نے کوشش یہ کی کہ جس طرح کسی رومن ایمپائر نے مجموعی حیثیت سے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اسی طرح اب پوری سلطنتِ روما اسلام کو قبول کرے اور میرا اقتدار برقرار رہے۔ اس نے اپنے سرکردہ لوگوں سے یہ معلوم کروایا کہ دیکھو کوئی عرب تو نہیں آئے ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو طلب کیا گیا اور پوری شان و شوکت

کے ساتھ دربار منعقد ہوا۔ اپنے تمام نائبین سلطنت بلا لئے، وہ بھی اس اعتبار سے بڑا عجیب ہے کہ اس نے بھرے دربار میں چاہا کہ حق واضح ہو جائے۔ سوالات تھے یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا خاندان کیسا ہے؟ ان کے ہاں کبھی بادشاہت تو نہیں تھی؟ ان تمام باتوں کا جواب حضرت ابوسفیان نے دیا۔ ایک بڑا عجیب قول ان کے متعلق ہے کہ میں قدم قدم پر چاہتا تھا کہ جھوٹ بولوں (اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہرقل ان سے سچ پوچھوا رہا ہے۔ ہرقل کی جج ایک بڑے ماہر کی جرح تھی، اور وہ ہر وہ بات اگلوا رہا تھا، جس سے ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا تو یہ عرب جو اُن کے ساتھ تھے کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے، لہٰذا میں جھوٹ نہ بول سکا۔ ہرقل نے یہ سوال بھی کیا کہ کہیں اُن کے خاندان میں بادشاہت تو نہیں رہی؟ کہ اس کھوئی ہوئی بادشاہت کو حاصل کرنے کے لئے یہ مذہبی سٹنٹ کھڑا کیا ہوا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کے متعلق جب اس نے سوال کیا تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ انہوں نے آج تک کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ایک سوال اس نے یہ بھی کیا کہ اس کے پیروکاروں میں اکثریت غرباء کی ہے یا امراء کی؟ جواب ملا غرباء کی! پھر کہا جو شخص اُن پر ایمان لے آتا ہے، کبھی واپس بھی پھرتا ہے؟ جواب ملا آج تک کوئی واپس نہیں پھرا۔ حضرت ابوسفیان سچ بولنے پر مجبور ہیں اور اس کے تمام نائبین یہ مکالمہ سُن رہے ہیں۔

جب اہل دربار پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہرقل مسلمان ہونا چاہتا ہے، تو اب دربار میں شور برپا ہو گیا اور پادریوں کے نتھنوں میں سے مارے غصّے کے شُوں شُوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ یہ چیز ہرقل کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ اُس کو اپنے حکومت زیادہ عزیز تھی۔ اس نے پادریوں سے کہا کہ میں تو تمہارے ایمان کی آزمائش کے لئے یہ مکالمہ کر رہا تھا کہ تم لوگوں میں ایمان موجود ہے بھی یا نہیں۔ اس طرح ہرقل محروم رہ گیا اور ایمان لا سکا۔

مقوقس شاہِ مصر کی طرف حضرت حاطب ابن ابی عطا گئے۔ وہ بھی عیسائی تھا اور حضورؐ کو پہچان گیا۔ اگرچہ ایمان وہ بھی نہیں لایا لیکن اس نے حضرت حاطب کے ساتھ

بڑے اکرام و تعظیم کا معاملہ کیا اور حضورؐ کی خدمت میں دو لڑکیاں بطورِ تحفہ ارسال کیں حضرت ماریہ قبطیہ اور حضرت شیریں، دونوں ایمان لے آئیں۔ حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے حضرت ابراہیم تولد ہوئے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گھوڑا دُلدُل بھی مقوقس ہی کا بھیجا ہوا تھا۔

حضرت نجاشی ایمان لا ہی چکے تھے لیکن ایک معاملہ ہوا جس نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ شرحبیل بن عمرو جو رؤسائے شام میں سے تھا، اُس کے پاس حضورؐ کے ایلچی حضرت حارث بن عمیرؓ گئے۔ اُس نے طیش میں آکر اُن کو شہید کر دیا۔ سفیر کا قتل ہمیشہ سے ایک بہت بڑا جرم ہے اور اسے اقدامِ جنگ تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ بات سلطنتِ رُوما سے مسلح تصادم کی تمہید بن گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضؓ کو اس کا علم دیا اور فرمایا کہ اگر یہ شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری علم سنبھال لیں۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر طیارؓ علم سنبھال لیں۔ اگرچہ لشکر میں بڑے بڑے صحابہؓ موجود تھے، لیکن حضورؐ نے سپہ سالار بنایا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام میں ساری اونچ نیچ ختم کر چکا ہے۔ قریش کی قرشیت اور ایک آزاد کردہ غلام کے مابین اسلام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس تین ہزار کے لشکر کے سامنے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کی فوج لے کر آگیا۔ دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ گویا ایسے ہی ہے جیسے ہماری (پاکستان کی) جنگ روس یا امریکہ سے چھڑ جائے۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ کا لشکر آرہا ہے، تو انہوں نے مجلسِ شوریٰ منعقد کی کہ اب کیا کیا جائے۔ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کوئی دانشمندی نظر نہیں آتی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ نے فرمایا کہ ہمارا مقصد تو شہادت ہے۔ اس سے بلند اور مقصد کیا ہوگا۔ جنگ کا فیصلہ ہوگیا، حضرت زید بن حارثہ رضؓ شہید ہوئے، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ شہید ہوئے، حضرت جعفر طیارؓ شہید ہوئے۔ حضرت جعفر شہید کے ساتھ عجیب معاملہ ہوا، اُن کے جسم پر ۸۰ زخم تھے اور ان میں سے کوئی پیٹھ پر نہ تھا۔ ایک ہاتھ کٹ گیا تو دوسرے میں عَلَم سنبھال لیا جب دوسرا بھی کٹ گیا تو دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں سے عَلَم اپنے سینے سے لگا لیا۔ آخر کار

دُنیوی اعتبار سے اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ وہ وقت تھا کہ اہلِ ایمان کے ایمان کی پوری آزمائش ہو گئی۔ منافقین اب کیا کریں، اُن کے لئے تو معاملہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں اپنا نام شامل رکھوانا چاہتے ہیں تو نکلنا پڑتا ہے اور اگر مرتد ہوں تو ویسے قتل کئے جائیں۔ اگر نکلتے ہیں تو صاف نظر آرہا ہے کہ موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ وہ کبھی بڑے ہی ناصحانہ انداز میں کہتے تھے: "لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ!" (اس سخت گرمی میں نہ نکلو!)۔ اُن کے مقابلے میں مسلمانوں سے جواب دلوایا کہ: قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ (اے نبی! کہہ دیجئے کہ جہنّم کی آگ اس سے کہیں زیادہ سخت گرم ہے!)۔ اب خود دیکھ لو، یا یہ گرمی لے لو یا وہ (جہنّم کی)۔ کسی نے کہا: غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ان لوگوں کی تو مت ماری گئی، یہ لوگ تو موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ جواب دلوایا گیا:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا۔

(کہو تم ہمارے متعلّق دو بھلائیوں میں کسی ایک کے منتظر ہو سکتے ہو، جبکہ ہم تمہارے متعلّق اِس امر کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ یا تمہیں اپنے کسی عذاب میں مبتلا کرے یا ہمارے ہاتھوں سزا دے!")

گویا کہ ہماری تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اگر ہم سب شہید ہو جائیں تو بہت بڑی کامیابی اور اگر کامیاب ہو کر لوٹ آئے تو تم بھی مانو گے کہ کامیاب ہیں۔ ہمارے لئے تو ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔

بہرحال حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم تیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ منزل منزل کرتے ہوئے شام اور عرب کی سرحد (تبوک) تک پہنچ گئے۔ ہرقل ۵، ۶ لاکھ کی فوج کے ساتھ موجود ہے، لیکن مقابلے میں نہیں آیا، یہ بڑا عقدہ ہے کہ کیا وجہ ہوئی کہ ہرقل مقابلے میں نہیں آیا۔ بات صاف ہے کہ ہرقل پہچان گیا تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ علمائے یہود یا علمائے نصاریٰ تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے: "يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ!" غزوۂ موتہ میں بھی وہ پیچھے ہی رہا اور خود دیکھتا رہا کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے، اور اب تو

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاملہ سنبھالا جو "سیف من سیوف اللہ" ہیں - اور وہ بڑی حکمت عملی سے لشکر کو بچا کر واپس لے آئے - یہاں مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ عورتیں باہر نکل آئیں اور خاک ڈالی گئی کہ تم اللہ کے راستے میں پیٹھ دکھا کر آئے ہو - لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انہوں نے درست کیا - سورۂ انفال میں یہ چیز موجود ہے کہ اگر حکمتِ عملی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو جائز ہے بشرطیکہ جان بچانا مقصود نہ ہو -

گویا کہ اس مرحلے کے بعد اب سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ شروع ہو گیا - اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری شروع کی، اور ۹ھ میں نفیرِ عام کا حکم دے دیا کہ ہر وہ مسلمان جو جنگ کے قابل ہے اٹھ کھڑا ہو - اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہر ایک کے لئے نکلنا لازم ہو - ترغیب و تشویق ہوتی تھی کہ اللہ کی راہ میں نکلو -

۱- اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا - (نکلو ہلکے ہو یا بھاری)

۲- یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

اے اہلِ ایمان! تمھیں کیا ہوا کہ جب تمھیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو زمین کا بوجھ بن جاتے ہو - کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی کو پسند کر لیا ہے - آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی معمولی متاع سے زیادہ نہیں

اب آپ اندازہ کر لیں کہ امتحان کس قدر کٹھن تھا - مدنی دَور میں مسلمانوں کے لئے ایک تو غزوۂ احزاب کا وقت اور دوسرے غزوۂ تبوک کا مرحلہ عظیم ترین آزمائش کے مراحل تھے - سخت گرمی کا موسم تھا اور قحط کا عالم تھا، کھجور کی فصل تیار تھی - نکل جاتے ہیں تو فصل اٹھانے والا کوئی نہیں ہو گا، اور فصل تباہ ہو جائے گی، لگ بھگ سات سو میل کا سفر طے کرنا ہے، ہر ایک کے پاس سواری موجود نہیں ہے، پھر یہ ٹکراؤ ہے سلطنتِ روما کے ساتھ - اب تک تو معاملہ ایک اور تین کا تھا - غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں یہی تناسب تھا - غزوۂ خندق میں ایک اور دس کا تھا، لیکن یہاں تو کوئی نسبت ہی نہیں حضورؐ کا مقابلہ سلطنتِ روما سے ہے - اُن کے پاس لاکھوں کی تربیت یافتہ فوج ہے اور یہاں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس آگئے تھے۔ وہ پاگل نہیں تھا کہ مقابلہ کرتا۔ حضورؐ تبوک میں بیس دن تک مقیم رہے۔ وہ اس سے باخبر تھا کہ چاہے چھری خربوزے پر پڑے یا خربوزہ چھری پر بات ایک ہی ہوگی، لہٰذا وہ طرح دے گیا اور مقابلہ میں نہ آیا۔ حضورِ اکرم نے بھی اس سے اُلجھنا اقدام نہیں فرمایا۔

غزوہ موتہ کے واقعہ سے اگر لوگوں کے حوصلے پست ہوئے تھے یا لشکرِ روما کی کوئی دھاک بیٹھ گئی تھی تو اس کا حضورؐ نے مداوا فرما دیا۔ حضورؐ بیس دن تک مقیم رہے آس پاس کے رُؤسا آتے رہے، کسی نے اسلام قبول کر لیا اور کسی نے اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح حضورؐ پورے علاقے پر دھاک قائم کر کے واپس تشریف لے آئے ـــــ ذہن میں رکھئے کہ اس کے بعد جب آپؐ کا انتقال ہوا ہے، تو جیشِ اسامہؓ تیار تھا، یہ تھا سلطنتِ رُوما سے ٹکراؤ کا معاملہ۔ سلطنتِ روما کے ساتھ اس کا آغاز خلافتِ راشدہ میں نہیں ہوا۔ اس پورے عمل کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفسِ نفیس کیا ہے۔ تبوک کے بعد جیشِ اسامہ تیار تھا اور حضرت زیدؓ کے بیٹے اُسامہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ یہ جیش صرف اس وجہ سے کارہا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں مبتلا تھے۔ یہ ہے دراصل اس عمل کا نقطۂ آغاز جو بعد میں دورانِ خلافتِ راشدہ اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

اِس بات کو ذہن میں رکھئے کہ خلافتِ راشدہ درحقیقت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے۔ مَیں بہت سی باتیں چھوڑے جا رہا ہوں ان پر اِنْ شاء اللہ مفصّل گفتگو ہوگی۔ اور مَیں کل اس کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔ تاریخ کے بارے میں جو مغالطے ان لوگوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، جو اپنے آپ کو اہلِ سنّت کہتے ہیں اُن کا ازالہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ورنہ خلافتِ راشدہ سے تو سخت بدظنی موجود ہے۔ عام نوجوان یہ کہتا ہوا ملے گا کہ خلافتِ راشدہ میں کیا رکھا تھا، سارا زمانہ باہمی خانہ جنگی کی نذر ہوگیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر خلافتِ راشدہ کی نفی ہو جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے کارنامے کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ اصل حجّت تو یہ ہے کہ ایک اجتماعی نظام کو چلا کر دکھا دیا جائے، اور یہ تقاضا اگر بتمام و کمال پورا ہوا ہے تو وہ دورانِ خلافتِ راشدہ پورا ہوا ہے۔ اس لئے کہ حضورِ اکرمؐ کی

اپنی حیاتِ طیبہ میں تو یوں کہئے کہ انقلاب کی تکمیل ہوئی۔ ابھی اس کی برکات کا ظہور تو پورے طور پر نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ انقلاب کے بعد اس کو مستحکم (CONSOLIDATE) کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی برکات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی مشیّت تھی اور سب سے بڑھ کر حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اختیار (یہاں اختیار قبول کرنے کے معنی میں ہے!) تھا، کہ آپؐ نے اس دُنیا میں مزید قیام کرنا گوارا نہ کیا ورنہ جی چاہتا ہے کہ حضورؐ اپنے انقلاب کی تکمیل کے بعد کچھ اور عرصہ اس دُنیا میں مقیم رہتے تاکہ جو لوگ ایک کثیر تعداد میں ایمان لائے تھے، اور جن کے بارے میں قرآن مجید میں ہے: "وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا"! اُن کی تربیت ہو سکتی اور اس کے لئے وقت درکار تھا کہ آپ ان لوگوں کی بذاتِ خود تربیت فرماتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر وہ لمحہ جو اس دُنیا میں بیت رہا تھا وہ آپ پر انتہائی شاق تھا۔ بس فرضِ منصبی کی تکمیل ہوئی، لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کا فریضہ مکمل ہوا، اُدھر اللہ کی طرف سے اِس کی شہادت بھی آگئی کہ:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

اور اِدھر حضورؐ نے بندوں سے بھی شہادت لے لی کہ:

"انّا نشهد انّك قد بلغت و ادیت و نصحت"!

اور حضورؐ نے "اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى!" کہہ کر اس دنیا سے رخصت کی درخواست کردی۔

ویسے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس حیاتِ دُنیوی کے دوران میں بھی اللہ سے کون سا بُعد تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"لِيْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِيْ فِيْهِ نَبِيٌّ مُّرْسَلٌ وَلَا مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ"!

کہ میرا اللہ کے ساتھ ایک خاص وقت بھی ہوتا ہے۔ یہ معیّت اور قرب بتمام وکمال حاصل ہے پھر بھی ایک حجاب اور پردہ تو موجود ہے۔ آپ اب اور زیادہ وقت کے لئے دنیا میں رہنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے بعد کل ۸۰، ۸۲ دن ہیں، جو آپ کے اس حیاتِ دنیوی میں گذرے، اور جب مرض الموت کے دوران آپؐ نے خطبہ دیا، حضرت

ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، حضور بیمار تھے۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو آپ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ نے اشارے سے منع فرمایا، اور خود حضرت ابوبکر رضؓ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اب یہ معاملہ ہے کہ حضورؐ کو دیکھ کر حضرت ابوبکر رضؓ رکوع و سجود کر رہے ہیں اور ابوبکر رضؓ کو دیکھ کر ساری جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا جس کے الفاظ یوں ہیں کہ: "اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہے تو دُنیا میں رہے اور اس کی نعمتوں میں سے حصّہ پائے، اور چاہے تو اللہ کے پاس آجائے۔ اللہ کے بندے نے دوسری بات قبول کر لی"۔۔۔ حضرت ابوبکر رضؓ رو پڑے، کیونکہ وہ مزاج شناسِ رسول تھے، اس لئے بات کو سمجھ گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ کا جو آخری وقت ہے اُس میں ایک تو یہ الفاظ بار بار زبان پہ آئے:

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اِن انبیاء، صدّیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ جن کو اللہ تعالیٰ نے انعامات سے نوازا۔۔۔ اور آخری وقت کے جو الفاظ مروی ہیں وہ یہ ہیں:

اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ ـــــ اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ

مَیں نے کبھی اس سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اگر میدانِ حشر میں کہیں موقع ملا تو حضورؐ سے شکوہ کریں گے کہ آپ نے اس سلسلہ میں محبّتِ خداوندی کے جذبے کے غلبے کی وجہ سے جلدی کی۔ ابھی یہاں بڑی ضرورت تھی کہ انقلاب کا استحکام ہوتا اور تربیت ہوتی اور ان نئے قبیلوں کو کسوٹی پر پرکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رحلت کے بعد "يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کی بجائے: "يَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کا معاملہ ہوگیا اور لاکھوں لوگ مرتد ہوگئے۔ ارتداد کا فتنہ کوئی فتنہ سا فتنہ تھا۔ نئے نبیوں کا دعویٰ نبوّت شروع ہوگیا۔ مسیلمہ کذّاب کے ساتھ جو جنگ ہوئی ہے وہ بہت بڑی جنگ تھی۔ مانعینِ زکوٰۃ کا معاملہ تھا کہ نماز پڑھو الو لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدّیق کی سیرتِ مبارکہ کا وہ پہلو سامنے آتا ہے۔ اس نحیف الجثہ شخصیّت

کے پردے میں کسی چٹان جیسی مضبوط اور پہاڑ جیسی بلند شخصیت موجود تھی۔ شاید حکمتِ خداوندی میں حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا اظہار مقصود تھا کہ فتنۂ مانعین زکوٰۃ کھڑا ہو گیا۔ ورنہ شاید دُنیا کو معلوم نہ ہوتا کہ ابوبکرؓ کی رقیق القلب شخصیت کے اندر کیسا فولادی انسان پنہاں ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ REVOLUTION کے بعد COUNTER-REVOLUTION ضرور ہوتی ہے اور REACTIONARY عناصر اُبھرتے ہیں۔ مخالف قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ اب ہم اس انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے تو وہ دبک جایا کرتی ہیں اور اپنے اوپر اس انقلاب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ موقع کی تاک میں رہتی ہیں کہ جب بھی موقع ملے گا ہم مناسب اقدام کریں گے۔ ان قوتوں کو REACTIONARY FORCES یا COUNTER-REVOLUTIONARY MOVEMENTS کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ سازگار فضا اور کیا ہو گی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں صدمے کی کیفیت کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کا تصوّر بھی نہیں کرتے ہوں گے کہ حضورؐ کبھی ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ جب حضرت عمرؓ کا یہ حال ہو گیا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تلوار سونت کر بیٹھ گئے کہ جس شخص نے کہا کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا ہے، میں اس کی گردن اُڑا دوں گا اور جلالِ فاروقی کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی؟ تمام لوگ دم بخود ہیں۔ ہاں مجال اگر کسی کی تھی تو وہ ابوبکر صدیقؓ تھے۔ وہ آئے سیدھے حجرے میں گئے، آپؐ کے جسدِ اطہر کو بوسہ دیا۔ اور خطبہ دیا:

من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیّ لا یموت۔

آپ پوچھئے کہ اس جملے کو کہنے کے لئے کتنے حوصلے اور جیتے کے جگر کی ضرورت تھی۔ وہ ابوبکرؓ جس کی رقیق القلبی کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ بدر میں مشورہ دیا کہ ان قیدیوں کو معاف کر دیا جائے۔ گویا اگر خلیفہ بلا فصل کہنا چاہئے تو ان کو، جن کی رائے اور محمدؐ کی رائے میں کوئی فرق نہیں ہے، اور پوری تاریخ کے دوران کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ایک ہو اور ابوبکر صدیقؓ کی دوسری ہو۔ ان کا مقام تھا

کہ آپؐ کی وفات کے بعد مذکورہ جملہ کہہ سکتے۔ یہ جملہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے رُوئیں رُوئیں میں توحیدِ خداوندی رچ بس گئی ہو۔ کہ "جو محمدؐ کو پوجتا تھا وہ سُن لے کہ محمدؐ کا انتقال ہوگیا ہے لیکن جو خدا کا پجاری تھا اور اللہ کی عبادت کرتا تھا، اس کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ اس کو موت نہیں آئے گی، وہ الحیّ ہے اور لایموت ہے!" اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ

"اور نہیں محمدؐ مگر پیغمبر جن سے پہلے بہت سے پیغمبر گذر چکے ہیں۔ کیا اگر وہ فوت ہو جائیں مارے جائیں تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے، اور جو بھی پچھلے پاؤں لوٹے گا اللہ کو کچھ ضرر نہ پہنچائے گا۔!"

اِس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار نیام میں چلی گئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پہ بیعت ہوئی، اور میں وقت کی کمی کی وجہ سے اس تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ بات سمجھ لیجئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے اس قدر شواہد موجود ہیں کہ جب تک کوئی شخص ڈھٹائی، ضد اور تعصّب کی پٹّی اپنی آنکھوں پہ نہ باندھ لے وہ ابوبکرؓ کی خلافت کا انکار نہیں کر سکتا۔

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی میں امامت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی، اور ذہن میں رکھیئے گا کہ اس امامت کو آج کی امامت پر قیاس نہ کیجئے گا۔ وہ ہماری امامت نہ تھی کہ جس کے بارے میں علّامہ اقبال مرحوم کہہ گئے ہیں ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے ❊ اِس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

وہ دو رکعت کی امامت نہ تھی، وہاں دین و دُنیا کی وحدت تھی۔ مسجدِ نبوی کے امام مُحمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں۔ اپنی حیاتِ طیّبہ کے دوران کے بعد خلیفۂ رسول ہی امام ہوئے۔ مسجدِ نبویؐ کے صحن میں تمام جھروکے بند کروا دیئے گئے، سوائے حضرۃ

ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حجرے کے۔ مرض الموت میں خطبہ ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ کی جان و مال نے مجھے جتنا فائدہ پہنچایا کسی اور کے جان و مال نے نہیں پہنچایا۔ اگر ان باتوں کے بعد بھی سمجھا جائے کہ راہ نمائی نہیں تھی تو کتنا غلط ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ حکم موجود نہیں تھا۔ آپؐ معاملہ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ پر چھوڑ گئے ہیں۔ اب اُن کا معاملہ اُن کے حوالے ہے۔ آپ نے ایک اُمّت تشکیل دی ہے، اور وہ ایسی اُمّت نہیں ہے کہ جسے شعور نہ ہو اور وہ بُرے بھلے کی پہچان سے عاری ہو۔ یہ وہ جماعت ہے جس کی تربیت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی۔ یہ جماعت جانتی ہے کہ کون کس چیز کا اہل ہے، اور اس وقت جو سب سے زیادہ اہل تھا، اُسی کو منتخب کر لیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد لوگوں کو تاکید کی کہ نہ تو مجھے خلیفۃ اللہ کہا جائے اور نہ ہی خلیفۃ المسلمین، میں تو خلیفۃ الرّسول ہوں (اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں)۔ یعنی جو مشن محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تھا، اُسی کی تکمیل میرا مقصدِ زندگی ہے۔ خلافتِ راشدہ عام معنٰی میں ہئیتِ حاکمہ نہیں تھی کہ صرف مسلمانوں کی حکومت ہو، اور قیامِ امن کے لئے کوئی انتظام ہو۔ یہ اُمور اُس کے اجزاء میں شامل ہیں، لیکن اصل مقصد محمد رسول اللہؐ کے مشن کی تکمیل تھا۔ اسی لئے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کہا گیا ہے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دو بعثتیں ہیں ایک اِلیٰ اَھْلِ الْعَرَب اور دوسرے اِلیٰ کافّۃ النّاس۔ اہل عرب کی حد تک تمام فرائض نبی اکرمؐ نے خود ادا کر دیئے، اور دوسرے عمل کا آغاز فرما کر دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا اور اس کے لئے یہ ادارۂ خلافت وجود میں آیا تھا۔ اِس خلافتِ راشدہ میں پہلی خلافت، خلافتِ ابوبکر صدّیق ہے۔ اِس میں یہ چیز اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ کہ اس میں اصل CONTRIBUTION یہ ہے کہ اندرونِ ملک انقلابِ محمدیؐ کے بعد اٹھنے والی تمام REACTIONARY FORCES کے ساتھ نبرد آزما ہو کر اور اِن سب کو کچل کر انقلابِ محمدیؐ کو مستحکم بنا دیا اور اس کے بعد ابوبکر صدّیقؓ بھی اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اگرچہ INTERNATIONAL PHASE کا اجراء تو ہو چکا تھا لیکن اس کا اصل دَور خلافتِ عمرؓ کا دَور ہے۔ آغاز حضورؐ نے فرمایا

تھوڑی سی پیش رفت حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دَور میں ہوئی۔ شامی فتوحات سے سلسلے کا آغاز ہو گیا لیکن اصل توسیع تو دَورِ فاروقیؓ اور دَورِ عثمانی میں ہوئی

انقلابِ نبویؐ کو مستحکم کرنے میں جس عزیمت کا معاملہ ہوا ہے اس کو حضرت عمرؓ سے تقابل کر کے دیکھئے۔ مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس وقت کے حالات کی شدت دیکھ کر مصلحت بینی کا مشورہ دے رہے ہیں کہ یہ چومکھی جنگ ایک دم شروع نہ کیجئے۔ مسلمانوں کے دل زخمی ہیں اور حوصلے پست ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جدائی سے طبیعتیں بہت پژمردہ اور مضمحل ہیں۔ ایک طرف نئے نبوّت کے دعویدار ہیں اور دوسری طرف مانعینِ زکوٰۃ۔ مدّعیانِ نبوّت کے خلاف نبرد آزما ہو جائیے اور مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی برتئے۔ اس لئے کہ ایک تو انہوں نے توحیدِ خداوندی کا انکار نہیں کیا، حضور کی نبوّت سے انکار نہیں کیا، نماز کا انکار نہیں کیا، صرف زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے مصلحت کو پیشِ نظر رکھئے، نیز جیشِ اُسامہ کو روانہ نہ کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا جواب تھا کہ جو جھنڈا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کھول دیا، مَیں اُسے کیسے تہ کر سکتا ہوں۔ یہ خلافت تو نہ ہوئی اور ان کے مشن کی طرف کوئی اقدام تو نہ ہوا۔ اُن کے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے لوں تو خلافت کا کیا فائدہ ہوا، اور اس کے بعد حضورؐ کی حدیث بیان کی

امرت ان اقاتل النّاس حتّٰی یشھدوا ان لا الٰہ الّا اللّٰہ وان محمّدًا عبدہ ورسولہ ویقیموا الصّلٰوۃ ویؤتوا الزّکٰوۃ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں کے ساتھ جنگ کروں تا آنکہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کر لیں گے تو میری طرف سے اُن کے جان و مال، سوائے اسلامی قانون کے، محفوظ ہو جائیں گے۔ اور اُن کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے!"

اہلِ عرب کے ساتھ جنگ اگر بند ہو سکتی تھی تو مندرجہ بالا تین شرائط کی بنیاد پر۔

یہ کم انہ کم ہیں اور میں ان میں کوئی ترمیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ہے وہ عزیمت جس کے حامل ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ الفاظ یہ آتے ہیں کہ اگر کوئی میرے ساتھ نہ نکلے گا تو میں تنہا جنگ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید شاملِ حال ہوئی تمام قوتوں کو کچل کر اندرونِ ملک اس انقلاب کو مستحکم کر گئے۔ مشیتِ ایزدی کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اگر یہ استحکام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں ہوا ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا عہد ۲۵ برس کی بجائے ۲۵۰ برس تک جاری رہتا۔ اَللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ـــــ اور آج میرا ذہن اس بات کی طرف منعطف ہوا کہ کیا عجب مشیتِ ایزدی کا یہی منشا ہو کہ عظمتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اگر یہ تمام مراحل آپؐ نے بنفسِ نفیس طے کرا دیئے ہوتے تو ابوبکر صدیق کی عظمت کیسے نمایاں ہوتی ـــــ اس اللہ کے بندے نے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران اپنے آپ کو اس طرح گم کر دیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں جداگانہ تشخص نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ مشیتِ ایزدی کو یہی چیز مطلوب ہو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی عظمت لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آئے۔

بہرحال یہ کارنامۂ صدیقی ہے جو تمہید بنا ہے اس بات کے لئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یکسو ہو کر بین الاقوامی مرحلے کی طرف متوجہ ہو گئے، جس کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ اسی سیلاب کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا ؎

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری ۔۔۔ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اس پر اِنْ شاء اللہ کل صبح گفتگو ہو گی۔ کل ٹھیک ساڑھے نو بجے جمع ہو گے اور خلافتِ راشدہ اور خاص طور پر "الفتنۃ الکبریٰ" شہادت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر اور اس کے بعد جو حالات اور واقعات سامنے آئے وہ عرض کروں گا۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

سلسلہ تقاریر سیرت - ۶ ڈاکٹر اسرار احمد

خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ اور انقلابِ نبویؐ کی توسیع

الحمد للہ ونحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضلله فلا ھادی لہٗ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ ونشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ، ارسله بالھدٰی ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کله وکفٰی باللہ شھیداً وصلّی اللہ علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ تسلیماً کثیراً کثیرا، امّا بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم وشرّ الامور محدثاتھا وکلّ محدثۃٍ بدعۃ وکلّ بدعۃ ضلالۃ وکلّ ضلالۃ فی النّار

امّا بعد - فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم ۝ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم
هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝

وقال تبارک وتعالٰی فی سورۃ النّور :- وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ

الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝ ...... صدق اللّٰہ العظیم ط

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَیَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ ۝ اللّٰھم الھمنی رشدی واعذنی من شرور نفسی، ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزق اجتنابہ آمین

—— یارب العلمین ۝ ——

میں اپنی تقریروں کا آغاز بالعموم ان دعاؤں سے کیا کرتا ہوں۔ ان کا ویسے تو ہر تقریب سے ہی بڑا گہرا تعلّق ہوتا ہے۔ لیکن آج جس نازک اور پیچیدہ معاملے پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دونوں دعائیں بہت اہم ہیں۔ بولنے والا، کہنے والا، بیان کرنے والا، اپنے حق میں بھی دعا کرے اور سامعین کے حق میں بھی دعا کرے: اللّٰھم الھمنی رشدی (اے اللہ! میرے دل میں وہی بات ڈال جو حق ہو، درست ہو، صحیح ہو) واعذنی من شرور نفسی۔ اور مجھے نفس کی شرارتوں سے اپنی پناہ میں رکھ کہیں کوئی نفسانیت، کہیں کوئی عصبیتِ جاہلیہ، کہیں کوئی تعصب، کہیں کوئی گروہی یا طبقاتی یا فرقہ وارانہ ضد اور ہٹ دھرمی میرے نقطۂ نظر اور میری رائے کو کج نہ کر دے۔ دوسری دُعا ہے: اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ۔ اے پروردگار! ہمیں حق کو حق دکھا، ہم حق کو حق ہی دیکھیں، حق کو حق سمجھیں اور ہمیں اس کے اتّباع کی توفیق عطا فرما اس میں اوّلاً حق کی پہچان اور ثانیاً اس کی اتباع کی توفیق کے لئے دعا کی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں مرحلے کٹھن ہیں۔ حق کے پہچاننے کے لئے بہرحال کچھ شرائط ہیں، جن میں خلوصِ نیّت کو اوّلیت حاصل ہے۔ لیکن حق کا پہچاننا جتنا مشکل ہے، پہچاننے کے بعد اس کو قبول اور اختیار کر لینا بدرجہا مشکل ہے۔ وارنا الباطل باطلاً۔ اور ہمیں باطل کو باطل دکھا۔ ایسا نہ ہو کہ تلبیس ابلیس لعین سے حق کو باطل سمجھ بیٹھیں یا باطل کو حق سمجھ لیں وارزقنا اجتنابہ۔ اور ہمیں اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما۔ یہ دونوں دعائیں بڑی اہم ہیں۔ عام حالات میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن بالخصوص آج کا جو موضوع ہے، اس کے اعتبار سے پہلے اپنے حق میں بھی اور آپ سب کے حق میں بھی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں یہ دونوں دعائیں کر رہا ہوں۔ اس کے بعد پہلے مجھے دو معذرتیں کرنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری روایات کے

خلاف آج ہمارا اجتماع دس منٹ تاخیر سے شروع ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ تقاریر کے ضمن میں ہمارا جو پروگرام تھا، اخبارات کی اطلاعات کی وجہ سے اس میں کچھ غلط مبحث ہو گیا ہے۔ دراصل آج کا عام اعلان جو "پاکستان ٹائمز" میں بھی آیا ہے وہ "اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ، اختتامِ خلافت سے تنسیخِ خلافت تک!" یہ اصل میں اگلی تقریر کا موضوع تھا۔ پروگرام یہی تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول آپ نے سُنا ہو گا کہ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ (میں نے اپنے ربّ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا!) کہ ہماری مشیّت، ہمارا ارادہ، ہماری خواہش، ہماری تمنّا اپنی جگہ لیکن اصل فیصلہ کُن چیز اللہ کی مشیّت ہے، ہوتا وہ ہے جو وہ چاہتا ہے کہ اپنے پورے عزم بالجزم کے باوجود جب ارادے بدلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کوئی بالاتر قوّت ہے کہ جس کا فیصلہ آخری ہے گویا کہ یہ بھی معرفتِ ربّانی کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ آج ہم خلافتِ راشدہ کے موضوع پر گفتگو کریں گے اور اس کے ضمن میں الفتنۃ الکبریٰ کا ذکر بھی ہو گا۔ کُبریٰ مؤنّث ہے اکبر کی، یعنی سب سے بڑا فتنہ، تاریخِ اسلامی کا بالکل رُخ بدلنے دینے والا فتنہ یعنی شہادتِ حضرت عثمانؓ پر بھی آج گفتگو ہو گی۔ بعد میں مسلمانوں کی تاریخ میں جتنے بھی فتنے اُٹھے آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر وہ اسی فتنے کی صدائے بازگشت ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کے جو تین حصّے رہ جائیں گے اُن کی تکمیل اِن شاء اللہ ہم اگلے ہفتے کریں گے کیونکہ آج تو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کرا ہی جانا ہے۔ اگلی جمعرات کو اِن شاء اللہ العزیز شام کو مغرب اور عشاء کے مابین "اختتامِ خلافتِ راشدہ سے تنسیخِ خلافت تک اور مسلمانوں کے عُروج و زوال کی تاریخ!" کے موضوع پر تقریر ہو گی اور اگلے جمعہ کو اِن شاء اللہ، اِسی وقت بقیّہ موضوعات پر ایک جامع تقریر ہو جائے گی اور اگلے جمعہ کو بفضلہٖ تعالیٰ یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

اب آیئے اصل موضوع کی طرف اور اس کے لئے چند بنیادی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ اس سلسلۂ تقاریر میں ہمارا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ نبوّت کا اصل مقصد کیا ہے۔ محاسبۂ اُخروی کے ضمن میں انسانوں پر اتمامِ حُجّت۔ یہ مقصدِ بعثتِ انبیاء ہے۔ مبادا کہ وہ یہ عُذر پیش کر سکیں کہ اے ربّ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اوّلیں حُجّت انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ حقائق ہیں، سماعت ہے، بصارت ہے، عقل و شعور کی صلاحیتیں ہیں، نیکی اور بدی کی تمیز ہے۔ قلب میں ودیعت شدہ معرفتِ ربّانی ہے، رُوح کی گہرائیوں میں ٹمٹماتا ہوا عشقِ خداوندی کا

جذبہ ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر ہر انسان مسئول ہے، جواب دہ ہے (ACCOUNTABLE) ہے، RESPONSIBLE ہے لیکن رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ انسانوں کے لئے مزید آسانی پیدا کی جائے۔ اس عظیم امتحان میں کچھ اور سہولتیں دی جائیں۔ وحی کا سلسلہ جاری فرمایا، ہدایتِ ربّانی نازل ہوتی رہی تاکہ عقل و خرد، شعور اور فطرت کے اندر جو صلاحیتیں مضمر ہیں، اُن کو اُجاگر کیا جائے۔ انبیاء نے حق اور عدل و راستی کی طرف دعوت بھی دی۔ اور اس پر عملاً چل کر بھی دکھایا۔ اتمامِ حُجّت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لئلا یکون للنّاس علی اللہ حجّۃ بعد الرّسل وکان اللہ عزیزاً حکیماً ۝ (تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں، اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی حجّت کوئی دلیل، کوئی عذر، کوئی بہانہ نہ رہے) قافلۂ نبوّت، قافلۂ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہ پہلا انسان، پہلا نبی بھی تھا۔ حضرت آدم علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے قافلۂ انسانی نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے اور نبوّت و رسالت بھی ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی تا آنکہ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نبوّت و رسالت، اتمام اور تکمیل کو بھی پہنچ گئی اور نتیجۃً ختم ہوگئی۔ یہ ختمِ نبوّت نتیجہ ہے اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کا۔ اس اتمام و تکمیلِ رسالت کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک اس اعتبار سے کہ نوعِ انسانی بحیثیتِ مجموعی عقل اور شعور کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عہدِ طفولیّت سے نکل کر بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی۔ لہٰذا اس قابل ہوگئی کہ الہُدیٰ (کامل ہدایت نامہ، ابدی ہدایت نامہ) اب اس کو عطا کر دیا جائے چنانچہ وہ قرآن مجید کی صورت میں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمّہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

دوسری طرف انسان کا اجتماعی شعور بھی ترقّی کی منزلیں طے کرتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا کہ اس دَور کا آغاز ہو رہا تھا، جس میں اجتماعیّت، انفرادیّت پر غالب آجانے والی تھی۔ ہیئتِ اجتماعیہ اور نظامِ اجتماعی کی اہمیّت فیصلہ کُن ہوجانے والی تھی، افراد اس کے شکنجے میں جکڑے جانے والے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اب صرف انفرادی ہدایت و رہنمائی نہیں اجتماعی ہدایت و رہنمائی عطا کی جائے۔ ایک ایسا نظامِ عدل و قسط عطا کیا جائے۔ جس میں انسان کے جُملہ عواطف، اُس کے جُملہ میلانات، اُس کی فطرت و طبیعت کے تمام جبلّی رجحانات کی تشفّی کا پُورا اہتمام ہو اور اُن میں بتمام و کمال توازن و اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک

چیز پر زور دیا جائے اور دوسری چیز ہاتھ سے جاتی رہی۔ آزادی پر زور دیا تو اونچ نیچ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انسانیت طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ مساوات پہ زور دیا تو آزادی کی چڑیا ہاتھ سے اڑ گئی۔ یہ نہ ہو۔ تمام چیزیں بیک وقت ایک اجتماعی نظام میں سموئی ہوئی پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ دینِ حق ــ اسلام ــ کی صورت میں انسان کو دے دیا گیا، اور اس کو چلا کر دکھا دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ حجّت بھی بتمام و کمال پوری ہو جائے۔
اسی ختمِ نبوّت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء و رُسُل صرف اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انبیاء و رُسُل کی اس مقدّس جماعت میں محمّد بن عبداللہ بن عبدالمطلب صلّی اللہ علیہ وسلّم فداہ آباءنا و اُمّھاتنا، پہلے اور آخری فرد ہیں جن کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہوئی اور اس تمام کو زمان و مکان دونوں کے اعتبار سے سمجھئے۔ پورے کرۂ ارضی کے لئے مکان کے اعتبار سے اور تا قیامِ قیامت زمان کے اعتبار سے۔ وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعٰلمین ۔ وما ارسلنٰک الّا کافّۃ للنّاس بشیرًا و نذیرًا ۔ یہی الفاظ۔ بشیر و نذیر۔ آئے ہیں اس آیت میں جو میں نے پہلے سنائی یعنی رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ○ حضورؐ، مُبشّر اور نذیر بن کر آئے۔ وہی بشارت اور انذار محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقصد بعثت ہے۔ ان تین امتیازات کے ساتھ ایک ہدایتِ کاملہ عطا کر دی گئی۔ اس کی حفاظت کا ذمّہ لے لیا گیا۔ دوسرے صرف انفرادی رہنمائی نہیں۔ نظامِ اجتماعی کے اعتبار سے ایک متوازن اور معتدل نظامِ عدل و قسط جسے الدّین القیّم کے نام سے جانتے ہیں، عطا کر دیا گیا اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۲۳ سالہ محنتِ شاقّہ جس کا ایک اجمالی نقشہ میں تین تقریروں میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں، کے نتیجہ میں دونوں کام کر دیئے۔ الھدیٰ کی تبلیغ مکمّل کی۔ یا ایھا النبیّ بلّغ ما انزل الیک من ربک فان لّم تفعل فما بلّغت رسالتہٗ۔ چنانچہ حجّۃ الوداع میں گواہی لے لی۔ آپ نے پوچھا: الا ھل بلّغت؟ اور جواب مل گیا کہ: انّا نشھد انّک قد بلّغت و ادّیت و نصحت۔ دوسری DIMENSION اسی ۲۳ برس کی محنتِ شاقّہ کی یہ ہے کہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو، دینِ حق کو بالفعل قائم کر دیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی، اللہ کا دین غالب ہو گیا، کفر اور شرک کا استیصال ہو گیا، زیادہ سے زیادہ اہلِ کتاب کو یہ OPTION دی گئی، کہ وہ چاہیں تو ذمّی بن کر رہ سکتے ہیں۔ اپنے دین یہودیّت و نصرانیّت پر قائم رہیں۔ البتہ یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ

وَهُمْ صَاغِرُوْنَ ۝ اپنے ہاتھوں جزیہ دینا ہوگا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ اس لئے کہ بڑا تو اللہ ہے، اللہ اکبر (بڑا اللہ ہے) بڑائی اللہ کے لئے ہے اور غلبہ اللہ کے دین کے لئے ہے: یا ایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر۔ یہ اسی تکبیر ربّ کا ظہور ہے اسی کا تقاضا ہے۔

یہ دونوں وہ کام ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب اور جزیرہ نمائے عرب دونوں کے اعتبار سے بہ نفسِ نفیس خود سرانجام دے دیئے۔ آپ کے کام کا تیسرا پہلو تھا، مذکورہ بالا اُمور کی عالمی سطح پر تکمیل۔ اب یہ فرضِ منصبی قرار پایا اُمّتِ محمّدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا۔ اسی خطبہ حجّۃ الوداع میں قرآن مجید کے بارے میں ہدایت دے دی کہ: فلیبلّغ الشاھد الغائب۔ اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں، اُن کو جو یہاں موجود نہیں۔ مَیں کل عرض کر چکا ہوں کہ بڑے ہی بلیغ الفاظ میں یہ تاکید فرمائی ہے۔ اس موقع پر موجود نہ ہونے والوں میں وہ بھی شامل ہیں جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب سے باہر تھے۔ وہ جو علّامہ اقبال نے کہا کہ:

بس رہے تھے یہیں سلجوقی بھی، تورانی بھی ❊ اہلِ چیں، چین میں۔ ایران میں ساسانی بھی!
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی، ❊ اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی!

تو نامعلوم کتنی اقوام تھیں، وہ بھی شامل ہوگئیں اور تا قیامِ قیامت ہونے والے تمام افرادِ نسلِ انسانی لفظِ غائب میں شامل ہوگئے۔

دوسرا پہلو ہے: لیظھرہ علی الدّین کلّہ۔ اس کو عالمی سطح پر پھیلانے کا۔ تو اس کا آپ نے بہ نفسِ نفیس آغاز فرما دیا۔ دعوتی خطوط لکھے جن کے نتیجے میں سلطنتِ روم سے تصادم کا آغاز ہوگیا۔ کل مَیں نے جو عرض کیا اس کو انگریزی میں IRONY OF FATE کہا جائے گا کہ دیکھئے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ جب سلطنتِ روما کو سلطنتِ ایران کے ہاتھوں شکست ہوئی تو مسلمانوں کے دل بجھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی تسلّی کے لئے قرآن مجید میں یہ پیش گوئی نازل فرمائی کہ گھبراؤ نہیں: الٓمّٓ ۝ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین ۝ لیکن اب یہ تاریخ کے عجیب حقائق ہیں کہ اسی سلطنت سے تصادم کا آغاز ہوا۔ پہلی لڑائیاں اُسی سے ہوئیں۔ سلطنتِ ایران کے ساتھ تصادم بعد میں ہوا۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرما دی تھی۔ جب آپ کو بتایا گیا

کہ آپ کا نامۂ مبارک خسرو پرویز نے چاک کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس نے میرا خط نہیں پھاڑا اپنی سلطنت کے پرزے کر دیئے۔ حضورؐ کی یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہنے والی تھی۔ لیکن عالمِ واقعہ میں پہلا تصادم رُوما سے ہوا۔ کل مَیں عرض کر چکا ہوں کہ ہرقل بھی خوب پہچان چکا تھا کہ حضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ مقوقس نے بھی پہچانا اور اب اس کے بعد شاہِ نجاشیؓ تو ایمان بھی لے آئے۔ بہرحال اس وقت یہ بات ذہن میں رکھئے کہ محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس کا آغاز فرما دیا۔ کل ایک نوجوان نے بعد میں سوال کیا تھا اس کا جواب میں یہاں اس مرحلے پر دے دینا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ ہمارے ہاں بڑا ہی پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ ایک جانب سے الزام عائد کیا گیا۔ دوسری جانب سے مدافعانہ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور حقیقت اسی خرافات میں کھو کر رہ گئی۔ الزام یہ تھا (جو مغرب اور عالمِ عیسائیت کی طرف سے عائد کیا گیا۔) کہ "یُوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!" یہ مسلمان بڑے وحشی لوگ تھے، انہوں نے اپنا دین بالجبر پھیلایا ہے، تلوار کے زور سے پھیلایا ہے۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں، ہم دلوں کو جیتتے ہیں، ہمارے مشن کبھی بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جبر اور طاقت کا استعمال نہیں کرتے۔ جب کہ اسلام اس کے CONTRAST میں قوّت سے پھیلا ہے، طاقت سے پھیلا ہے، تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بھیانک تصویر دُنیا کے سامنے آتی ہے۔ نتیجۃً ہمارے ہاں ملّت اور دین کے ساتھ خیر خواہی رکھنے والے نیک اور بھلے لوگوں نے مدافعت کی۔ اُن کی نیّتیں غلط نہیں تھیں، نیّت تو یہی تھی کہ مدافعت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اور دین محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اور اُمّتِ محمدؐ کی ہو لیکن انداز ابتداءً بڑا معذرت خواہانہ تھا کہ نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اسلام میں جنگ تو صرف مدافعت کے لئے جائز ہے۔ جارحانہ جنگ اسلام میں ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں سرسیّد احمد خاں مرحوم ہیں، ان کا خلوص و اخلاص شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن ہر دَور کا کچھ اثر ہوتا ہے کہ جس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے یہ انداز اختیار کیا۔

سوال یہ ہے کہ اس میں اصل نقطۂ عدل ہے کیا؟ یہ بات جان لینی چاہیئے۔ مَیں نے اپنی گذشتہ تقریروں میں دو مواقع پر اس کو ضمنی طور پر DEAL کیا تھا۔ ایک ہجرت کے فوراً بعد جب سلسلۂ غزوات کا آغاز ہوا تو مَیں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ سمجھئے کہ اگر مکّے کی طرف

سے کوئی پیش قدمی نہ ہوتی تو حضورؐ بھی مدینے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینِ حق کا غلبہ کیسے ہوتا، کفر اور شرک کا استیصال کیسے ہوتا۔ اللہ کا وہ گھر جو بتکدہ بنا ہوا تھا۔ اُسے نجاست سے پاک کیسے کیا جاتا۔ PEACEFUL CO-EXISTANCE یا STATUS-QUO - وغیرہ بڑے خوبصورت سے نام ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں اُن کا وجود کہیں نہیں ہے۔ حق اور باطل CO-EXIST نہیں کر سکتے، حق آئے گا تو باطل پیچھے ہٹے گا۔ باطل بڑھے گا تو حق دبے گا۔ ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کو گوارا نہیں کر سکتے: جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقدام فرمایا مکے کا ——— ECONOMIC-BLOCKADE کر کے آپ نے اس کی معاشی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفیر کے قتل کو برداشت کر لیتے تو جنگِ موتہ نہ ہوتی، یہ جنگ نہ ہوتی تو سفر تبوک نہ ہوتا۔ پھر جنگِ موتہ کے نتیجہ میں اگر کچھ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا تو غزوۂ تبوک میں اس سے کہیں زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں کل عرض کر چکا ہوں کہ دبدبہ قائم ہو گیا۔ آپ بیس دن تبوک میں مقیم رہے، بیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ، معمولی بات نہیں ہے اور قیصر مقابلے میں نہیں آسکا، تمام علاقے کے جو سردار تھے۔ رؤسا تھے، قبائلی شیوخ تھے۔ وہ آئے کسی نے اسلام قبول کر لیا، کسی نے معاہدہ کر لیا۔ اس کے باوجود جیشِ اُسامہ کس لئے تیار کیا۔ کوئی FRESH PROVOCATION ہسٹری کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جیشِ اُسامہ تیار رہے، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور میں یہ کل عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ کہا بھی گیا۔ مشورہ دیا گیا بڑے پر زور طریقے سے کہ ان تین محاذوں میں سے کم از کم ایک محاذ کو ابھی آپ بند کر دیں۔ یک وقت تین محاذوں کا کھولنا درست نہیں ہو گا۔ حکمت کے خلاف ہو گا، لیکن وہ تو خلیفہ کا [illegible] ات ذہن میں رکھئے کہ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ اکمل ہیں، اسی طرح [illegible] بکر رضؓ خلیفۂ کامل تھے۔ خلافت کا جامہ بتمام وکمال حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی شخصیت پر راست آتا ہے۔ انہوں نے اس مشورہ کے جواب میں فرمایا کہ جو کام حضورؐ نے کیا یا اس کا آغاز کیا، میں اس سے قدم کیسے پیچھے ہٹا لوں۔ جو کم سے کم شرائط محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیں، ان سے کم پر میری صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا

کروں گا تو ترمیم ہو جائے گی۔ آج کل ایک لفظ چلتا ہے REVISIONIST- کوئی انقلابی نظریہ آتا ہے، وہ قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے پیرو سوچتے ہیں کہ اس پر چلنا مشکل ہے، کچھ ترمیم کر دو، آپ کو معلوم ہے RUSSIA اور CHINA کے درمیان یہی بات بنائے نزاع ہے۔ مارکس (MARX) کا جو فلسفہ تھا اور LENIN کا جو اصل انقلاب تھا، انہوں نے اس میں ترمیم کر دی۔ روس اس پر قائم نہیں رہا۔ یہ CHINA کا بڑا CHARGE ہے اور وہ روسیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ REVISIONIST ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کم سے کم شرائط میں سے اگر کسی کو کم کر دیتے تو یہ وہ REVI-SIONISM ہوتا جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقف میں ترمیم ہو جاتی جو حضرت ابوبکر صدیق رضہ سے کسی طرح ممکن نہ تھی۔ چنانچہ جیشِ اُسامہ گیا اور وہی تمہید بن گیا، سلطنتِ روما کے ساتھ باقاعدہ جنگوں کا اور فتوحات شام شروع ہو گئیں۔ ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیے، کیونکہ یہ اپنی جگہ اٹل تاریخی حقائق ہیں اور اب سمجھئے اس بات کو قرآن مجید کے مطالعہ سے میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں۔ اس معاملے میں جو نقطۂ عدل ہے کچھ اس طرح بَیْنَ بَیْنَ واقع ہوا ہے کہ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں تلوار کو سرے سے کوئی دخل نہیں اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی تبلیغ ہی تلوار کے بل پر ہوئی۔ اسلام دو چیزوں میں بڑا بنیادی فرق کرتا ہے۔ ایک ہیں افراد اور ایک ہے نظام اجتماعی۔ افراد میں سے کسی فرد کو اپنا دین تبدیل کرنے پر اسلام مجبور نہیں کرتا۔ پوری تاریخ میں کسی ایک ایسے واقعہ کا بھی ذکر نہیں، لیکن غلط بنیادوں پر مبنی نظامِ اجتماعی کو اسلام گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کو ملیامیٹ کرنا، اس کو توڑنا مسلمانوں کے لئے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی معذوری کی وجہ سے رُکے رہے تو اور بات ہو گی کہ اَلْمَجْبُوْرُ عِنْدَ اللہِ مَعْذُوْرٌ، جیسے کہ جنگ میں بھی کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جیسی کہ جنگِ موتہ میں پیش آئی تو منظم پسپائی اختیار کر لی جس کی اجازت مُتَحَیِّزًا او مُتَحَرِّفًا (سورۃ انفال) کے دو الفاظ میں دی گئی ہے۔ اسی طریقے سے اگر طاقت نہیں ہے تو بات اور ہے۔ لیکن اگر طاقت ہو اور کسی باطل نظام کا وجود گوارا کر لیا جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ غلط نظام کو بالجبر اور بالقوّت توڑا جائے۔ وجہ کیا ہے۔ اس کو سمجھئے اور یہ فلسفۂ دین کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ میں

پہلے ختمِ نبوّت کے ضمن میں عرض چکا ہوں کہ غلط نظام بندوں اور ربّ کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جہاں اور بڑی خدمات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے SOCIAL THINKER کی حیثیت سے، دو اعتبارات سے اس نظامِ اجتماعی کی اہمیّت کو واضح کیا ہے۔ (آپ کو معلوم ہے کہ سوشیالوجی (SOCIOLOGY) ایک جدید علم ہے اور اس دور کا سب سے بڑا سوشل مفکر وہ ہے جو اجتماعی مسائل کا حل بتائے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کو اپنے وقت کا سب سے بڑا SOCIAL THINKER کہا جا سکتا ہے) ایک تو یہ کہ اگر نظام ظالمانہ ہو، اور کوئی حرج نہیں اگر استحصالی نظام کے الفاظ استعمال کر لئے جائیں۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس تو عیش و عشرت کے لئے ہر چیز کی فراوانی ہے اور کچھ لوگ دو وقت کی نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں۔ جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے، وہ اس کی وجہ سے خدا سے دُور ہو گئے ہیں اور جن کے لئے دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل ہو گیا ہے، وہ بالکل ڈھور ڈنگروں کی سطح پر آجاتے ہیں، وہ خدا کو کیا پہچانیں اور اس کی کیا بندگی کریں۔ دو وقت کی روٹی کے لئے جدّ و جُہد میں مصروف رہتے ہیں جیسے باربرداری کا اُونٹ یا کولھو کا بیل ہو۔ اگر انسان کو اس سطح پر گرا دیا جائے، تو اس کے لئے اس کا کہاں امکان ہے کہ وہ یہ سوچے کہ یہ آسمان کس نے بنایا، یہ زمین کس نے بنائی، فطرت کے اشارات کو پڑھے۔ ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

کہاں معرفتِ ربّانی اور کہاں عبادتِ ربّانی۔ انسان ان چیزوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہ ظالمانہ نظام سب سے بڑا حجاب بن جاتا ہے بندے اور ربّ کے درمیان۔ یہ ہے اہمیّتِ نظامِ اجتماعی کی۔ اس لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات، کتاب اور میزان کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ: لیقوم النّاس بالقسط (تاکہ لوگ عدل اور انصاف پر قائم رہیں) یہ سورۂ حدید کی آیت ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا، پوری آیت یوں ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

پچیسویں پارہ کی سورۂ شوریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ: فلذٰلك فادع

واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل آمنت بما انزل من کتاب وامرت لاعدل بینکم۔ آخری حصۂ آیت کا مطلب ہے: "مجھے حکم ہوا ہے تمہارے مابین عدل کا۔ یہی بات ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ بیعتِ خلافت کے بعد جو پہلا POLICY STATEMENT دیا، اس میں خلافت کی غرض و غایت OUT LINE کی جا رہی ہیں:

"مسلمانو! تم میں ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے، جب تک کہ ان سے حق وصول نہ کر لوں۔ اور ہر ضعیف قوی ہے، جب تک کہ میں اُس کا حق نہ دلوا دوں!"

یہ ہے اس بات کی اہمیّت کہ نظامِ باطل کو کسی درجے میں گوارا نہ کیا جائے۔ یہ ظالمانہ نظام ہے جو کسی خاندان کو نوعِ انسان کی گردن پہ مسلّط کر رہا ہے۔ وہ حاکم یہ محکوم۔ ع:

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے!"

کہیں اس نے سرمایہ کو ایک لعنت بنا کر مسلّط کر دیا اور انہیں دو طبقات میں تقسیم کر دیا ایک محروم طبقہ اور دوسرا وہ طبقہ جس کے متعلق میں نے ابھی کہا تھا کہ انہیں فراوانی کا ہیضہ ہو گیا ہے۔ جن کی ایک ایک تقریب پہ لاکھوں روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک زمانے میں جب کہ لاہور میں میرے درس کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا۔ کچھ حضرات کو حُسنِ ظن ہو گیا تھا۔ وہ میرے درس سمن آباد میں شریک ہوا کرتے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے لڑکے کی شادی کا مرحلہ آیا، اس نے آ کر کہا کہ اگر ابّا جان ہوتے تو یقیناً آپ سے درخواست کرتے کہ آپ نکاح پڑھائیں۔ انہوں نے کہا نکاح آپ پڑھائیں۔ میں نے حامی بھر لی لیکن میں جو اس بارات میں گیا اور میں نے جو شادی کا نقشہ وہاں دیکھا، معلوم ہوتا تھا کہ ہر درخت کے ہر پتّے کے ساتھ ایک قمقمہ لگا ہوا ہے، اور روشنیوں کا طوفان، وہ ہیرے اور ان کے لباس اور بے شمار انسان۔ اس وقت جو میں نے تقریر کی وہ میری زندگی کی سخت ترین تقاریر میں سے تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خطبۂ نکاح جنتر منتر کے انداز میں تو پڑھتا نہیں ہوں۔ خطبہ تو خطبہ ہوتا ہے۔ خطبے کی غرض تذکیر ہے۔ میں نے کہا — اور یہ ۶۸ - ۱۹۶۷ء کی بات ہے — ہماری منافقت یہ ہے کہ ہم نام لیتے ہیں فاطمۃ الزّہراء رضی اللہ عنہا کا اور عمل ہمارا یہ ہے۔ یعنی قول اور فعل میں بالکل مطابقت نہیں ہے

علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت فرمائی ہے :؎

اگر پندے ز درویشے پذیری ❊ ہزار اُمّت بمیرد تو نہ میری!
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر ❊ کہ در آغوش شبیرے بگیری!

اس زمانے میں بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے، سرخ ٹوپیوں والوں کے۔ سرمایہ دار بڑا گھبرا رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا تھا، یہ کہاں سے آگئے۔ یہ کہیں RUSSIA سے نہیں آئے، یہ IMPORTED نہیں ہیں۔ یہ آپ کی ان غلط حرکتوں کا نتیجہ ہے جو سامنے آرہا ہے۔ میں نے کہا، یہی بیرے جو آپ کو SERVE کر رہے ہیں، آپ کے شوفر، آپ کے چوکیدار، آپ کے خانساماں وغیرہ، ان میں سے کتنے ہی ہوں گے، جن کے گھروں میں جوان بچیاں بیٹھی ہوں گی اور وہ اُن کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکتے۔ ان کے جو کم سے کم لوازمات ہیں، وہ بھی اُن کو میسّر نہیں۔ اور آپ کے ہاں یہ اللّے تللّے ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت خوب سمجھ لیجئے کہ نظامِ باطل کسی صورت گوارا نہیں، اس کا قلع قمع کرنا ہے۔ اسلام اس کے لئے طاقت استعمال کرتا ہے، اگر ہو، نہ ہو تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر قوّت ہو تو وہ تلوار استعمال کرتا ہے۔ میں کل عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں نے ہمیشہ تین ALTERNATIVES دیئے اور یہ بھی کوئی بعد کی بات نہیں ہے۔ یہ حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے دیئے ہوئے ہیں بلکہ خود قرآن کے دیئے ہوئے ہیں۔ اِس کی اصل وہ حکم ہے جو قرآن مجید کی سورۂ توبہ میں یہود بنی نضیر کے بارے میں بیان کیا گیا۔ مشرکینِ مکّہ کے لئے کوئی OPTION نہیں ہے۔ مشرکینِ عرب کے لئے حکم ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ گردن اُڑادی جائے گی۔

تیسرا اگرچہ صراحتاً مذکور نہیں ہے تاہم خود بخود مفہوم ہے کہ یا پھر اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چنانچہ حضرتِ عکرمہ رضؓ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن اہلِ کتاب کے لئے تین OPTIONS ہیں۔ اسلام لے آؤ، اس صورت میں ہمارے بھائی ہو گے۔ جس طرح کسی دوسرے مسلمان کا جان و مال محترم ہے، ایسی ہی تمھاری جان و مال کا احترام ہوگا۔ یہ نہیں کرتے تو: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صَاغِرُوْنَ ؀ چھوٹے بن کر رہو، جزیہ دو، تمھیں کوئی بالجبر مسلمان نہیں کرے گا۔ رہو یہودی اور عیسائی لیکن چھوٹے ہو کر رہنا پڑے گا ــــ LAW OF THE LAND اس کا ہوگا جس کی فی الواقع زمین ہے، کیونکہ: "الارض للّٰہ ، الملک للّٰہ!" PERSONAL LAW

میں تم جو چاہو کرو۔ اگر دونوں چیزیں منظور نہیں ہیں تو میدان میں آؤ، تلوار ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ یہ تاریخ کی وہ حقیقت ہے جس کے لئے کسی ریسرچ کی ضرورت نہیں ہے۔ تو جس نے کبھی تاریخِ اسلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ یہی تین ALTERNATIVES ہیں۔ لہٰذا اس نقطۂ عدل کو پہچان لیجئے کسی فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، نہ کیا جائے گا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔

نظامِ باطل جو یقیناً ظالمانہ نظام ہے۔ کوئی نظامِ باطل عادلانہ نہیں ہو سکتا۔ عادلانہ نظام تو صرف اللہ کے دین کا ہے۔ اس نظامِ باطل کو مسلمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام اس کے وجود کو اپنے لئے چیلنج (CHELLENGE) سمجھتا ہے۔ اس کا قلع قمع جبر اور قوت کے ساتھ، اسلام کا نصب العین ہے۔ اس میں یہ بات ضرور ہے اگر بالفرض ایسے حالات ہو جائیں کہ ہمیں تبلیغ اور اپنے نظریات کی اشاعت کا بھرپور موقع دیا جائے تو ضروری نہیں کہ پہلے مرحلے میں تلوار اٹھائی جائے۔ لیکن ظاہر بات ہے یہ IF جو ہے IT IS A BIG IF۔ کیا روس (RUSSIA) کبھی گوارا کرے گا کہ آپ وہاں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں؟ ہر نظام اپنا تحفظ کرتا ہے، لہٰذا وہ کبھی برداشت نہیں کرے گا۔

اس اعتبار سے اگر مسلمانوں کے پاس طاقت ہو تو نظامِ باطل کا قلع قمع کرنے کیلئے اس طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ یہ ہے اس سلسلے میں نقطۂ عدل۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دوران ایک جملہ فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاص نے اس وقت فرمایا، جب ایرانیوں نے اُن سے پوچھا کہ آپ لوگ ہم پر چڑھائی کر کے کیوں آئے ہیں؟ لیکن اس سے پہلے اس HISTORICAL BACK GROUND کو ذہن میں رکھئے کہ اس وقت دو عظیم سلطنتیں تھیں جو اپنے وقت کی SUPER POWERS تھیں۔ ایک سلطنتِ کسریٰ اور دوسری سلطنتِ رُوما۔ اِن دونوں کے درمیان واقع تھا جزیرہ نمائے عرب کا علاقہ جو ایک لق و دق صحرا تھا۔ دونوں سلطنتوں میں سے کسی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی، جیسا کہ عام طور پر غیر زرخیز سرحدی علاقوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہر سلطنت انہیں اپنے زیرِ اثر رکھنے کی کوشش کرتی تھی

ویسے درحقیقت یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا، اور ایسے ہی دیگر علاقوں کے باشندوں کی طرح اُن کا پیشہ بھی لوٹ مار تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب اپنے گھر میں پیدا کچھ نہ ہوتا ہو تو کہاں سے کھائیں گے۔ گئے کوئی ہلّہ بول دیا، کہیں سے کچھ لوٹ مار کے لے آئے، پھر کسی اور جانب جھپٹا بول دیا۔ چنانچہ عربوں میں یہی طریقہ رائج تھا، تو ایرانیوں نے یہ کہا کہ تم پہلے تو اس طرح آیا کرتے تھے۔ اب تم کسی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے، یہ فرق کیوں ہے؟ ہم تمہیں دے دلا دیتے ہیں، جو کہتے ہو دے دیتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے وہ تاریخی جملہ کہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیجئے۔ زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ ایسی ہی سفارت کے موقع پر وہ جملہ بھی آیا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جنھیں زندگی کی نسبت موت زیادہ عزیز ہے۔ پہلے ہم لوٹ مار کرتے تھے، جینے کے لئے، اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لئے۔ لیکن اب جو لوگ آئے ہیں، ان کی تو قلبِ ماہیت ہو چکی ہے، وہ بالکل بدلے جا چکے ہیں۔ اب یہ وہ لوگ ہیں جنھیں زندگی کی نسبت موت عزیز تر ہے۔

دوسرا جُملہ شروع ہوتا ہے: انا قد اُرسلنا یعنی ہم بھیجے گئے ہیں، خود نہیں آئے۔ پہلے لوٹ مار کرنے آتے تھے، لیکن اب ہم ایک مشن پر ہیں۔ ہماری جو سابقہ تاخت ہوتی تھی، اس سے ہمارا یہ حملہ مختلف ہے کہ اب میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ اور پھر اس جملے میں مناسبت ہے رسالت سے۔ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ، اس سے فعل مجہول ہے اَرْسَلَ (بھیجا) اُرْسِلَ بھیجا گیا۔ ہم بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسالتِ محمدیؐ کا مشن ہے، جس کی تکمیل پر ہم مامور ہیں:

انا قد ارسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجهالة الى نور الايمان

(تاکہ ہم لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر انہیں ایمان کی روشنی میں لے آئیں)

اگلا جُملہ اس سے بھی اہم ہے: ومن جور الملوک الى عدل الاسلام۔ اور بادشاہوں کے ظلم و تشدد کی چکی سے، جس میں وہ پس رہے ہیں، نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ اب اس جُملے کو سمجھ لیجئے، یہ خلافت راشدہ کا مشن ہے، یہ ماٹو (MOTTO) ہے خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا، کیوں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اسے صرف مسلمانوں کی ایک حکومت نہ سمجھئے، صرف ایک سیاسی نظام نہ سمجھئے۔ اگرچہ ایک سیاسی نظام یا ہیئتِ اجتماعیہ کے اعتبار سے اس کی برکات بھی بڑی ممتاز ہیں۔ لیکن اسے صرف اس حد تک سمجھیں گے اور اس اعتبار سے اسے ASSESS کریں گے، تو اس کی پوری تصویر سامنے

نہیں آسکے گی۔ وہ درحقیقت جانشینیٔ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم، خلافت رسالت یا خلافت علیٰ منہاج النّبوۃ ہے۔ اس خلافت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر میں کل عرض کرچکا ہوں۔ یہ دَورِ خلافت مختصر تھا لیکن کارنامہ انتہائی عظیم تھا۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد انقلابِ محمّدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کے خلاف جتنی قوّتیں اُبھریں، جن کو آپ REACTIONARY FORCES کہہ سکتے ہیں اور COUNTER - REVOLUTIONARY MOVEMENT - بھی کہہ سکتے ہیں۔ انقلاب کو کالعدم کرنے کے لئے اقدام بھی کہہ سکتے ہیں، جو چاہیں کہہ لیں۔ مقصود تو ایک مفہوم کا ابلاغ ہے ۔ عبارا تنا شتّیٰ وحسنك واحد " اے اللہ! ہماری عبارتیں مختلف ہوسکتی ہیں، تیرا حسن و جمال تو ایک وحدت ہے!"۔ ان تمام REACTIONARY FORCES کو مکمل طور پر کچل کر رکھ دیا۔ وہ ان تمام قوّتوں سے پوری قوّت کے ساتھ جیسے آپ انگریزی میں WITH AN IRON WILL - AN IRON HAND کہیں گے، نبردآزما ہوئے اور اس انقلاب کو جزیرہ نمائے عرب کی حد تک کامل طور پر CONSOLIDATE کرکے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اب اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا چوبیس سالہ دور ہے، یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ نوعِ انسانی پر محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جو اصل حجّت قائم ہوئی ہے، وہ اسی دَور میں ہوئی ہے، اس لئے کہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی برکات کا ظہور اب ہوا ہے۔

حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ ایک مسلسل جدّوجُہد، ایک پیہم کشمکش سے عبارت ہے۔ میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حالات و واقعات کی رفتار اتنی سریع اور اس کا TEMPO - اتنا تیز تھا کہ واقعۃً ایک دفعہ تو انسان چکرا جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو ایک LIFESPAN میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور ایک وسیع و عریض خطّے پر ایک نظام بالفعل قائم ہوگیا۔ اور کُل بائیس ۲۲ برس میں دعوت بھی ہوگئی، تنظیم بھی ہوگئی، تربیت بھی ہوگئی، کشمکش بھی ہوگئی، تصادم بھی ہوگیا، مسلّح تصادم ہوگیا، فتح بھی ہوگئی، قیامِ امن بھی ہوگیا۔ اور یہ سب کچھ صرف بائیس ۲۲ برس میں ہوگیا، تو اب آپ خود سوچئے کہ حالات و واقعات کی تیز رفتاری کا کیا عالم ہوگا۔ اگرچہ جو نظام پھر خلافتِ راشدہ میں قائم ہوا ہے، اُس کا پورا CREDIT حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جاتا ہے۔ آخر عمرؓ کون ہے؟ عمر ابن الخطاب کو عمرؓ

فاروقؓ کس نے بنایا؟ یہ کس کی مسیحائی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ حضورؐ ہی کی تربیت کا کرشمہ تھا، اس لئے اس کا سارا CREDIT حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جاتا ہے۔ جیسے ایک بند کلی ہو اور پھر وہ کھل کر پھول بن جائے، پھول میں پتیاں وہی ہیں جو کلی میں تھیں، کسی نئی پتی کا اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن بہرحال وہ پھول کھلتا ہے تب پتیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ کلی میں وہی پتیاں ہیں لیکن بند ہیں تو POTENTIALLY وہ ساری برکات نبی اکرم صلی اللہ کے قائم کئے ہوئے نظام میں اوّل یوم سے موجود تھیں۔ لیکن ان کا جو ظہور ہوا ہے، وہ دورِ خلافت عمر فاروقؓ اور دورِ خلافت حضرت عثمانؓ میں ہوا ہے (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) یہ ذہن میں رکھئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے بارے میں بڑے بڑے معلّمے لوگوں کے ذہن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں اس پر تفصیلی گفتگو تو بعد میں کروں گا، اس وقت یہ ذہن میں رکھئے کہ طویل ترین دورِ خلافت حضرت عثمانؓ کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اڑھائی سال، حضرت عمرؓ کے دس سال اور حضرت عثمانؓ کے بارہ سال۔ ان بارہ سالوں میں سے دس سال تو بالکل اُسی شان کے ہیں، جس شان کا دورِ فاروقی تھا۔ اختلاف، تنازع، فتنہ، یہ سب کچھ آخری دو سالوں میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں یہ نقشہ بٹھا دیا گیا ہے کہ شاید خیر و خوبی اور بھلائی صرف دورِ فاروقی میں تھی۔ دورِ عثمانی میں تو فتنہ تھا، فساد تھا، اختلاف تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخی غلطی ہے، جس کا ازالہ کر دینا ضروری ہے۔ دس سالہ دورِ فاروقی اور حضرت عثمان کے پہلے دس سالوں کو ملا کر بیس سال بنتے ہیں۔ بیس سال کے اس عرصہ میں دو کام ہوئے ایک تو لیظھرہ علی الدّین کلّہ۔ اس کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ: ؎

"اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو ❊ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا!"

شام فتح ہوا، ایران فتح ہوا، ترکستان کے علاقوں تک بات پہنچی ہوئی ہے، شمالی افریقہ تقریباً پورا فتح ہو چکا ہے، ایشیائے کوچک فتح ہو چکا ہے، صرف تھوڑا حصّہ۔ مدینۃ القیصر یعنی قسطنطنیہ۔ بچا ہوا ہے۔ سلطنتِ رُوما کی تین ٹانگیں تھیں، جن میں سے دو ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ تین برّاعظموں پر پھیلی ہوئی بہت بڑی سلطنت تھی۔ پورا شمالی افریقہ، پورا مغربی ایشیا ایشیائے کوچک جسے ASIA MINOR (چھوٹا ایشیا) کہتے ہیں۔ پھر نیچے SYRIA اور اردن (JORDON) یہ مغربی ایشیا ہے اور کچھ اس کے مقبوضات تھے جو یورپ میں

تھے، اب وہ سمٹ کر یورپ تک محدود ہو گئی، ذرا سی انگلی قسطنطنیہ پر ٹکی رہ گئی۔ رہی سلطنتِ کسریٰ تو اس کے تو وہ پرزے ہوئے کہ یا ید و شاید۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کر دیئے ہیں۔ یہ ذہن میں رکھیئے کہ فتوحات کے اس سیلاب میں کشور کشائی یا مالِ غنیمت کو مقصود کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ ع "شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن ؛ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!" اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا کہ مسلمان کا اس سے بڑا مقصد اور کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی تمنا ہے جو اللہ نے پوری نہیں کی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کوئی تمنا اللہ تعالیٰ پوری نہ کرے۔ عجیب بات ہے لیکن نہیں کی۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں: میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں! قتل فی سبیل اللہ کی یہ لذت اور پھر بھی آپؐ کی تمنا پوری نہیں کی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے کہ رسول کبھی قتل نہیں ہوتے۔ رسول نمائندہ ہے اللہ کا، اللہ کی حکومت کا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے!)۔ رسول کہیں مغلوب ہونے کو آئے تو پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔ کوئی رسول مغلوب نہیں ہوتا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

ایک معنیٰ تو مقتول فی سبیل اللہ ہونا ہے اور دوسرا اللہ کے دین کی گواہی اور توحید کی گواہی دینا جیسے اقبال نے کہا ع: "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت پہ گواہی!" یہ وہ گواہی ہے جس کو ادا کر کے آپ اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ یہ گواہی انفرادی طور پر بھی دی جاتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

بہرحال ایک کام تو یہ ہوا کہ اتنے وسیع و عریض رقبے پر سے انسانوں کو بادشاہوں کے ظلم سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرایا گیا۔ غلامی کے جوئے ان کی گردن سے اتار دیئے، اور اس امر کی گواہی دوسروں نے بھی دی ہے۔ کسریٰ کا ایک ایلچی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے آیا۔ اس نے اہلِ مدینہ سے پوچھا، تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ جواب ملا: لَیْسَ لَنَا مَلِکٌ وَلَنَا اَمِیْرٌ۔ ہمارا بادشاہ وادشاہ کوئی نہیں ہے،

ہمارا تو ایک امیر ہے۔ اس نے پوچھا: اچھا تو اس امیر کا قصرِ امارت کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا، اُس کا کوئی قصرِ امارت نہیں، وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر مدینہ سے باہر گیا ہے۔ وہ اٹھا اور باہر جاکر دیکھا کہ عمر فاروق رضؓ ایک جھاڑی کے سائے میں اپنے کوڑے کو تکیہ بنائے ہوئے پڑے ہیں۔ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، وہ یوں فرشِ زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ کچھ دیر دم بخود اس منظر کو دیکھتا رہا اور آخر کہہ اٹھا کہ اے عمر! تم عدل و انصاف سے کام لیتے ہو، لہٰذا تمھیں کوئی ڈر نہیں، ہمارے بادشاہ ظلم کرتے ہیں، لوگوں کا خون چوستے ہیں، اس لئے ہر وقت کانپتے رہتے ہیں اور اسی لئے انہیں باڈی گارڈ بھی چاہئیں۔ انہیں اُونچی اونچی فصیلوں والے محل بھی چاہئیں تحفظات چاہئیں۔ یہ تھی وہ رائے جس کا اظہار سفیرِ کسریٰ نے اسلام کے نظامِ عدل اور اپنے ہاں کے نظامِ جور کے متعلق ظاہر کی۔

تو اتنے بڑے رقبے پر اسلام کو غلبہ ہوا، غلبہ اس معنیٰ میں کہ نوعِ انسانی کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں، غلامی کے طوق ان کی گردنوں سے اُتار دیئے گئے۔ ع

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!"

کوئی حاکم نہیں، کوئی محکوم نہیں، کوئی مالک نہیں، کوئی مملوک نہیں۔ صرف ایک چیز ہے کہ: کونوا عباد اللہ اخوانا ○ اس بات کو نوٹ کر لیجئے کہ: HUMAN-FREEDOM- کا سب سے بڑا چارٹر، اسلامی چارٹر ہے۔ یہ UNO اور LEAGUE OF — NATIONS کے چارٹر کیا، سب سے بڑا MAGNA CARTA حقوقِ انسانی کا وہ خطبہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ: الفضل ما شهدت به الأعداء (اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دے!) یہ اقرار ایچ۔ جی ویلز (H.G. WELLS) کا ہے۔ وہ بہت معروف شخصیت ہے۔ SCIEN-TIFIC FICTION میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اس نے کہانیاں (STORIES) لکھی ہیں، جو سائنسی خیالات پر مبنی ہیں۔ اس کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ (HISTORY) کو بھی FICTION بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسے خوبصورت پیرائے میں تاریخ لکھی ہے کہ آدمی پڑھے تو ذرا بوجھل محسوس نہ ہو۔ اس کی دو کتابیں SHORT-CONCISE HISTORY OF THE WORLD — اور — HISTORY OF THE WORLD — بہت مشہور ہیں۔ اس بدبخت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی ازدواجی زندگی پر بڑے زبردست حملے کئے ہیں، بڑے رقیق حملے کئے ہیں۔ کیونکہ تعددِ ازواج کی کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے کسی طرح نیچے اترتی ہی نہیں۔ اوّل تو اُن کے ہاں شادی کرنا ہی گھٹیا کام ہے، اُن کی اپنی VALUES ہیں۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنا اُن کے ہاں اُونچے درجے کا کام ہے۔ شادی کرنا اور پھر متعدد شادیاں؟ یہ انہیں کسی طرح قبول نہیں۔ ویسے ایک معاملے میں، مَیں اُس کی حماقت کی داد دیتا ہوں۔ ایسی احمقانہ بات لکھی ہے، جس کا اسے جواب دینا چاہیئے، جواب وہ کسی اور سے مانگ رہا ہے۔ میں کیوں بیان کر رہا ہوں، نقلِ کفر، کفر نباشد۔ مجھے اس کے بیان کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے، بیان اس لئے کر رہا ہوں کہ معلوم ہو جائے کہ وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دشمن ہے۔ دشمن اگر کسی پہلو سے عظمت کی گواہی دے، تو وہ عظمت مُسلّمہ ہوتی ہے۔ تو مَیں پہلے اس کی دشمنی ESTABLISH کر رہا ہوں۔ اس نے عجیب جملہ لکھا ہے کہ: "حیرت ہے کہ اتنے گھٹیا انسان (مراد حضورؐ ہیں) کے گرد ایسے عظیم لوگ کیسے جمع ہو گئے!"۔ پہلا نام خدیجۃ الکبریٰ کا لیا ہے، دوسرے لوگوں میں حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ، عمر فاروق رضؓ اور عثمان غنی رضؓ شامل ہیں۔ تو خدا کے بندے! اس کا جواب تو دے۔ اگر تو اُن کی عظمت کا قائل ہے، یا یوں کہو کہ یہ احمق تھے، بیوقوف اور کودن تھے۔ انہیں تو تو مان رہا ہے۔ اُن کی عظمت کو تسلیم کر رہا ہے اور جس سورج کے گرد یہ چاند جمع ہیں، اس کا انکار کر رہا ہے۔ یہ تو تمہاری اپنی آنکھ کا قصور ہے بہرحال اس کی دشمنی کو ESTABLISH کرنے کے لئے مَیں نے یہ چند باتیں بتائیں۔ اب یہی شخص ہے جو پورا خطبہ حجۃ الوداع نقل کر رہا ہے۔ ذہن میں رکھیئے اس PROPORTION کو۔ وہ ایک VOLUME میں پوری نسلِ انسانی کی تاریخ لکھنے والا ہے لیکن خطبہ حجۃ الوداع پورے کا پورا نقل کر رہا ہے۔

ہاں تو وہ کہتا ہے کہ: جہاں تک انسانی حُرّیت، اُخوّت اور مساوات کے وعظوں (SERMONS) کا تعلق ہے تو یہ SERMONS دُنیا میں بہت کہے گئے۔ JESUS OF NASARAT (مسیحِ ناصری) نے بھی بہت کہے لیکن تاریخِ انسانی میں ان اُصولوں پر معاشرہ صرف محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے قائم کیا ہے۔ اس سے بڑا TRIBUTE اور ہو نہیں سکتا، اور پھر ایسے ذلیل شخص کی زبان سے، جس کی نگاہوں سے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتی عظمت چھپی رہ گئی ہے لیکن وہ حضورؐ کے کارناموں کو کیسے

جھٹلا سکتا ہے۔ اگر چرچل کا تعصب اُس کی آنکھوں کی پٹی بن گیا اور حضورؐ کی شخصی عظمت کا وہ اندازہ نہ کر سکا۔ لیکن تاریخ کی ایک عظیم حقیقت کو جھٹلائے تو کیسے جھٹلائے۔ بہرحال اتنے وسیع و عریض رقبے پر اس نظام کو قائم کر دینا، جس میں ہر اعتبار سے عدل و قسط اور انصاف مکمل ہو، درحقیقت اسلام کا ایک عظیم احسان تھا۔

مَیں نے ایک بار پہلے بھی عرض کیا تھا اور آج بھی اشارۃً وہی بات کہی۔ اب اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ نظامِ اجتماعی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ CONFLICTING ہوتے ہیں۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتیں باہم ٹکراتی ہیں۔ انسان کہتا ہے مجھے آزادی ہونی چاہئے، مَیں جو چاہوں کروں، جو چاہوں سوچوں، جو چاہوں زبان سے بک دُوں، آزادی ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ آزادی اجتماعی اعتبار سے مضر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اب نقطۂ عدل کیا ہے کہ آزادی بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعی مصلحتیں بھی پامال نہ ہوں۔ بڑا کٹھن کام ہے، بہت مشکل معاملہ ہے۔ سب مانتے ہیں کہ مساوات ہونی چاہیئے، سو فیصد مساوات تو ظاہر ہے نہ کبھی دُنیا میں ہوئی ہے نہ ہوگی اور نہ ہی فطرت کے مطابق ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے سرخ و سپید رنگت دی ہے، کسی کا رنگ سیاہ کر دیا ہے، کیا کریں۔ کسی کو یورپ میں پیدا کر دیا، کسی کو افریقہ میں پیدا کر دیا، کیا کریں۔ کسی کو ذہنی صلاحیتیں بہت دے دیں مگر جسمانی قوّت نہیں دی۔ کوئی اگر چھ سات گھنٹے تک مسلسل کشتی چلا سکتا ہے تو اسے سوچنے کی طاقت نہیں دی۔ تو یہ فرق اور تفاوت تو ضرور رہے گا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے قطعے تو چائنا نے بھی انفرادی ملکیت میں دے رکھے ہیں۔ بہرحال کچھ آزادی تو دینی پڑے گی، کامل مساوات تو ممکن نہیں — RUSSIA بھی ایک حد کو جا کر وہیں پر واپس آیا ہے۔ نجی ملکیت کو ایک محدود پیمانے پر (LIMITED SCALE) پھر جاری کرنا پڑا ہے۔ یہ فطرتِ انسانی ہے بیشک مساوات بھی مطلوب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کو تو کھا کھا کے ہیضہ ہو رہا ہے اور ایک نانِ جویں کا محتاج ہے۔ لیکن اس کی خاطر انسان کو اس طرح پابند کر دینا کہ آزادی بالکل ہی سلب ہو جائے، یہ بھی فطرت کے خلاف ہے، کیا کریں بڑا مشکل معاملہ ہے۔ نوعِ انسانی انہی مسائل میں ٹھوکریں کھا رہی ہے، ایک بند کھولتے ہیں تو دوسرے کئی

بند حصوں میں جکڑے جاتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام (FUDAL SYSTEM)
پوری دُنیا میں تھا۔ کیا تھا، بادشاہ تھا۔ بادشاہ کے نیچے BARONS ہیں۔ اور LORDS ہیں۔ پنج ہزاری، بیس ہزاری، تیس ہزاری منصبدار ہیں۔ ان کے علاقے ہیں، اُن علاقوں کے وہ کامل مالک ہیں۔ رہنے والے سب ان کی رعیت، غلام در غلام۔ یورپ نے حقوق حاصل کرنے کے لئے بڑا زور مارا، بڑی بڑی قربانیاں دیں ـــــ وہ DIVINE RIGHTS OF KING کے دعوے کے ساتھ مسلّط تھے۔ اُن سے حقوق لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ آزادی حاصل ہوئی تو وہ ایسی غیر معتدل ہوگئی کہ روپیہ میرا ہے، میں جو چاہوں کروں، چاہے شراب خانہ کھولوں، چاہے قحبہ خانہ کھولوں، مجھے آزادی حاصل ہے۔ کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے، روپیہ میرا ہے، مجھے آزادی حاصل ہے کہ اُسے سود پر چلاؤں، اس پر قدغن کیسی؟

چنانچہ اس آزادی نے سرمایہ داری کی لعنت کی شکل اختیار کر لی۔ جاگیرداروں سے نجات پائی تو سرمایہ دار مسلّط ہوگئے کہ صاحب مجھے آزادی حاصل ہے، کارخانہ میرا ہے میں تو مزدوری دوں گا تیس روپے، کسی کو کام کرنا ہے تو کرے، نہ کرنا ہو نہ کرے مزدور بھی آزاد ہے، مگر مزدور آزاد کہاں۔ جب وسائل کا ارتکاز چند لوگوں کے پاس ہوگیا ہو؟ کبھی آپ کے ہاں AERATED WATER چلتے تھے۔ ہر گلی میں آپ کے ہاں مشین لگی تھی۔ تھوڑے سے پیسے کسی کے پاس ہوئے، اُس نے مشین لگالی بوتلیں بھر بھر کے بیچنے لگا۔ مگر پھر یہ بڑے بڑے کارخانے لگ گئے اور وہ مشین غائب ہوگئی۔ ہر شخص کے لئے اس سطح کا کارخانہ لگانا ممکن نہیں، جس سطح کا ایک سرمایہ دار لگائے گا۔ اب چھوٹی معیشت والوں کا دروازہ بند ہوگیا، اور زیادہ سے زیادہ لوگ مجبور ہوگئے کہ ان کارخانوں میں جاکر ملازمت کریں۔ بظاہر آزاد ہیں لیکن درحقیقت مجبور ہیں کہ دو اڑھائی روپے اُجرت پر کام کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ چیزیں انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو ـــ

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں ٭ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری!

اور بغاوت تو ہوگی۔ ظلم ایک حد کو پہنچنے کے بعد ایک ردِّ عمل کو جنم دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسی رنگ میں کچھ عرصہ تک سرمایہ داری مُسلّط رہی۔ اب سرمایہ داری

سے نجات پانے کے لئے ایک نئی تحریک چلی۔ چنانچہ اب جو انسان نے سوچا تو سوشلزم (SOCIALISM) کہہ لیجئے یا کمیونزم (COMMUNISM) کہہ لیجئے، ایک پارٹی سٹیٹ قائم ہوگئی۔ یہ پارٹی اب BIG LAND LORD ہے، BIG زمیندار ہے۔ BIG سرمایہ دار ہے۔ آپ کی آزادی سلب، جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ جو نظام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا، اور جس کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ میں ہوا، وہ کیا تھا۔ آزادی کا یہ عالم ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ مسجدِ نبوی میں خطبہ دے رہے ہیں۔ (یہاں یہ عرض کردوں کہ یہ خطیب و امام اُن میں سے نہیں جن کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے ۔ اس کو کیا سمجھیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام

بلکہ عمر فاروقؓ خلیفۂ وقت ہیں!) ایسے میں ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے، جس نے پھٹا پرانا کمبل پہن رکھا ہے اور عمر فاروق رضؓ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: "لا سمع ولا طاعۃ" کہ نہ کوئی بات سنیں گے اور نہ ہی اطاعت کریں گے۔ یہ کلمۂ بغاوت ہے۔ عمر فاروقؓ پوچھتے ہیں، کیوں بھائی! وہ شخص جواب دیتا ہے کہ آپ نے جو کُرتہ پہن رکھا ہے وہ مالِ غنیمت کی چادروں سے بنا ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے جتنا حصّہ ملا ہے اس سے کُرتہ نہیں بنتا، آپ جیسے طویل القامت شخص کا اس سے کُرتہ کیسے بن گیا۔ جواب دیجئے کہیں خیانت تو نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا تھا: "اگر میں سیدھا چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر لازم ہے!" تو یہ درویش بھی عمر فاروقؓ کو سیدھا کر رہا ہے۔

اب آپ غور کیجئے، بہترین سے بہترین جمہوری ملک میں بھی صدرِ مملکت، صدرِ ریاست (HEAD OF THE STATE) کو کتنا تحفظ دیا جاتا ہے۔ اس کی عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ذاتی معاملات کو زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا، اور یہاں معاملہ صرف ایک معمولی کرتے کا ہے۔ اس پر بھی جواب طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا کہ تم بتاؤ، انہوں نے کھڑے ہو کر TESTIFY کیا کہ میں نے اپنے حصّے کا کپڑا بھی ابّا جان کو دے دیا تھا۔ کیونکہ کُرتا نہ میرا بن رہا تھا نہ اُن کا۔ اس طرح اُن کا کرتہ بن گیا۔ اس پر وہ درویش کہتا ہے کہ: "الآن نسمع ونطیع" کہ ہاں،

اب ہم سُنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ حُرّیت کا اِس سے اُونچا کوئی معاملہ انسان نے کبھی پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔ ایک گورنر نے اپنے گھر کے باہر ڈیوڑھی بنالی تھی۔ آخر وہ گورنر ہے اُسے کوئی وقت آرام کے لئے بھی چاہیئے، یہ تو نہیں کہ جو چاہے اور جب چاہے منہ اُٹھائے، اندر چلا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے، لیکن اس پر بھی قصرِ خلافت سے (یہ قصر کا لفظ بھی مَیں نے ایسے ہی کہہ دیا، حالانکہ وہاں قصر یا محل نام کی تو کوئی چیز تھی نہیں) بہرحال دارالخلافہ کی جانب سے ڈانٹ پڑی کہ لوگوں کو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا ہے، تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ڈیوڑھی مسمار کروادی۔ آرڈی ننس نافذ ہوتا ہے کہ حق مہر فلاں حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے، آرڈی ننس ہے عمر فاروق رضؓ کا، مگر ایک عورت اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ عمر! جس حق کی کوئی حد نہ اللہ تعالیٰ نے قائم کی، نہ اللہ کے رسول ﷺ نے، تم کون ہوتے ہو اُس کی حد مقرر کرنے والے۔ اور عمرؓ بلاتأمل کہتے ہیں کہ آج ایک بڑھیا نے عمر کو دین سکھایا، یہ کہہ کر آرڈی ننس واپس لے لیا — یہ ہے آزادی۔ اگر آزادی کسی چڑیا کا نام ہے تو اس سے بڑی آزادی کا تصوّر ناممکن ہے۔ اس آزادی کے ساتھ اب آپ تصوّر کیجئے مساوات کا۔ وہ مساوات نہیں کہ آپ نے سو آدمیوں کو ایک رسّے سے باندھ دیا اور کہا کہ دوڑو، اور آپ خوش ہو گئے کہ اس طرح وہ دوڑ میں مساوی رہیں گے، نہ کوئی آگے ہوگا نہ پیچھے۔ ایسی مساوات نہیں بلکہ وہ مساوات کہ دوڑنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ چونکہ شخصی ملکیت ایک INCENTIVE ہے، اس لئے اسلام میں اِس کی پوری آزادی ہے، لیکن اس دوڑ میں آگے پیچھے رہنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ یہ دو اور دو چار کی طرح ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔ اب یا تو رسّے سے سب کو باندھ دیجئے، کوئی نہ آگے رہیگا نہ پیچھے۔ مگر جب کھلا چھوڑیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی آگے آئے گا اور کوئی پیچھے۔ اسلام اس تفاوت کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا نظامِ معاشیات ایسا عادلانہ ہے کہ اس میں ایک RATIO اور PROPORTION ہوتی ہے۔ آگے والوں سے کیا لیا جائیگا اور پیچھے رہنے والوں کے بنیادی ضروریات کو۔ UNDER WRITE کر دیا جائے گا۔ وہ بہرحال اُن کو مل کر رہے گا، لکیر کھینچ دی گئی۔ چاہے تو جدید اصطلاح میں HAVES اور HAVENOTS کہہ لیجئے، چاہے فقیر اور غنی فقیر کون ہے؟ جس کے پاس سات تولے سونا نہیں ہے، چھ تولے ہے تو کوئی حرج نہیں

وہ فقیر ہے اور زکوٰۃ لینے کا حقدار ہے۔ جو لوگ اس پالے سے ادھر ہیں وہ اغنیاء ہیں۔ ساڑھے سات تولے سونا اور باون تولے چاندی یہ نصاب ہے، یہ ایک حد ہے۔ جو اُدھر چلے گئے وہ اغنیاء ہیں، جو اِدھر رہ گئے وہ فقراء ہیں۔

زکوٰۃ کیا ہے؟ تؤخذ من اغنیاءھم وترد الیٰ فقراءھم۔ اگرچہ بات لمبی ہو رہی ہے، تاہم میں عرض کر دوں کہ دُنیا میں اس وقت جو معاشرے ہیں اُن میں انگریزوں کا معاشرہ بڑا UNIQUE ہے۔ اِس قوم میں ایک طرف تو روایت پرستی اس کی گھُٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ہر نئی چیز کے لئے کان کھلے بھی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔ جو نئی بات آئے گی، اُس پہ کھُلے دل سے غور کریں گے، سوچیں گے اور اس میں جو اچھا پہلو ہوگا، لے لیں گے: "خُذ مَا صَفَا وَدَع مَا کَدِر!" مثلاً بادشاہت سے جمہوریّت تک کا سفر طے کیا، خون کسی نے دیا، فرانسیسیوں نے، انقلاب کہیں آیا۔ خُون کی ندّیاں کہیں بہیں۔ لیکن بہترین جمہوریّت کون لے گیا۔ انگریز۔ اس کے باوجود بادشاہت برقرار، روایت کی روایت قائم اور جمہوریّت کی جمہوریّت۔ بالشویک ریوولیوشن (BOLSHVEK REVOLUTION) آیا RUSSIA میں SOCIALIST-ECONOMY کا تجربہ وہاں ہوا، خون ریزی ہوئی اور SOCIALISM اور CAPITALISM — کا امتزاج کہاں ہو رہا ہے، U.K میں SUBSIST-ANCE ALLOWANCE کون دے رہا ہے؟ U.K لیکن ساتھ ہی آزادی بھی برقرار ہے۔ اگر آپ UNEMPLOYED ہیں تو STATE آپ کی بنیادی ضروریات کو UNDER-WRITE کر دے گی، وہ آپ کو مہیا کرے گی۔ آپ اسے ہفتہ وار لے لیجئے تاکہ آپ کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ یہ اصل میں SYNTHESIS ہے۔ اور یہ وہ SYNTHESIS ہے جو اپنے آخری نقطۂ عروج پہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچے گا، بڑی خونریزیوں کے بعد وہاں پہنچے گا، پہنچے گا لامحالہ وہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کہیں اور جائے۔ یہی خیال ہے ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم کا، جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب: "IDEOLOGY OF FUTURE!" میں کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل کا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ چاروناچار نوعِ انسانی ادھر جا رہی ہے لیکن وہ ٹھوکریں کھا کر جائے گی، دھکّے کھا کر جائے

گی، خونریزیوں کے بعد جائے گی، تجربے کرے گی۔ ان تجربوں سے نا معلوم کتنا کچھ نقصان ہوگا۔ تاہم چار و ناچار پہنچے گی وہیں۔ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ⁂ آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست ⁂ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

وزیر اعظم چین چو۔ این۔ لائی کی بیٹی سائیکل پر سکول جاتی ہے۔ اپنی جگہ یہ واقعی ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ اس سے ہمارے ذہنوں پر بڑا رعب طاری ہو جاتا ہے، لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے ⁂ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اب اس مساوات کو دیکھئے حضرت عمر فاروق بہ نفسِ نفیس شہر بیت المقدّس کا چارج لینے جا رہے ہیں، کیونکہ مسلمانوں نے محاصرہ کر رکھا ہے۔ شہر کی فصیلیں بڑی مضبوط ہیں، شہر اپنی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ راشن بہت، پینے کے لئے پانی بہت۔ اہلِ شہر کے لئے کوئی خاص دقّت نہیں تھی، فصیلیں اور دروازے بند کئے بیٹھے ہیں۔ خود ان کی طرف سے پیشکش ہوتی ہے۔ پادری سفید جھنڈے لئے ہوئے فصیل پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: مسلمانو! تم قیامت تک بھی یہاں پڑے رہوگے تو شہر فتح نہیں ہوگا۔ ہاں! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ شہر فتح ہوگا تو ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس کے کچھ اوصاف ہیں، کچھ علامات ہیں، وہ ہمارے ہاں لکھی ہوئی ہیں، تم میں ہمیں ویسا کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سُن کر ایک دم حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ بادشاہ تو عمرؓ ہے۔ اس لئے دارالخلافہ میں اُن کے تشریف لانے کے لئے عرضداشت بھیجی گئی۔ چنانچہ تشریف لائے۔ پادریوں نے کہا تھا کہ اگر وہ درویش بادشاہ خود آجائے تو ہم شہر کے دروازے کھول دیں گے، اور اس کے حوالے کر دیں گے۔ آپ کو کسی خونریزی کی ضرورت نہیں، یہ تھا مقصد سفر کا۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ کوئی پرائیویٹ VISIT نہ تھی، STATE — VISIT تھی اور اس سے زیادہ اہم سرکاری VISIT کون سی ہوگی۔ مدینے سے بیت المقدّس تک کا کتنا لمبا سفر ہے، اگر ہزار نہیں تو لگ بھگ سات سو میل تو ضرور ہوگا۔ EXACTLY نہیں کہہ سکتا، آپ سوچتے ہوں گے، ساتھ بڑا لاؤ لشکر ہوگا۔ ENTUR-AGE، خدم و حشم، سیکرٹری، باڈی گارڈ ہوں گے۔ مگر یہاں کیا ہے؟ تنہا عمرؓ، ایک

اُونٹنی، ایک غلام، اس عالم میں سفر ہو رہا ہے۔ ایک منزل عمرؓ اونٹنی پر سوار ہوتے ہیں اور نکیل غلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگلی منزل میں غلام سوار ہے اور مہار پکڑے عمرؓ پیدل چل رہے ہیں۔ یہ دُنیا دس بار ختم ہو کر پھر پیدا ہو لے تو بھی اس مساوات کی کیا، اس کے آس پاس کی مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔ نہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مثل ممکن اور نہ خلافتِ راشدہ کی مثال ممکن۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے انتقال پہ ایک بات کہی تھی کہ اے ابوبکرؓ! تم اپنے بعد آنے والے کے لئے بڑی سختی پیدا کر گئے، ایسا معیار قائم کر گئے جس پر پورا اُترنا آسان نہیں۔ بہرحال ہمارا معیار اور IDEAL یہی نظام ہے جو یہ حضرات قائم کر گئے۔ THESE ARE NOT FAIRY TALES۔ یہ پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔ یہ نظام قائم ہوا ہے، بالفعل قائم ہوا ہے، دُنیا کی شہادت ہے کہ قائم ہوا ہے۔ اس شہادت کی ایک ECHO سمجھئے یا صدائے بازگشت کہیے جو اس صدی کے آغاز میں مہاتما گاندھی کی زبان سے اُس وقت بُلند ہوئی جب کانگرس کی PROVINCIAL CABNETS بنی تھیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس نے کسی اشوک، کسی وکرماجیت، کسی چندر گپت موریا اور کسی رام چندر کی مثال پیش نہیں کی۔ کی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ یہ ہے میری گفتگو کا موضوع، جسے میں نے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!" کے مصداق، شاید ذرا زیادہ پھیلا دیا۔ بہرحال یہ ہے اتمامِ حجت، یہ ہے بعثتِ انبیاء کی غرض و غایت اور یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا تقاضا۔ ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے لئے پوری انقلابی جدّ و جہد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور پھر اُس کے خلاف اٹھنے والی COUNTER REVOLUTIONARY FORCES سے خلیفہ کامل، خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نبرد آزما ہوئے اور بالکل ایک SETTLED معاشرہ دے کر رخصت ہوئے۔ اب اس چمن میں جس میں ہل چل چکے تھے، کاشتکاری ہوئی ہے، اور دورِ فاروقی و عثمانی میں ایک لہلہاتی فصل، نوعِ انسانی کے لئے نظامِ عدلِ اجتماعی کے عملی نمونے کی صورت میں جملہ برکات کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

رُوداد سفر

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

"سِیْرُوا فِی الْاَرْض" سے طبعی مناسبت

سیر و سفر کا شوق یوں تو غالباً راقم کی گھٹی ہی میں پڑا ہوا تھا، لیکن زندگی کا رُخ رفتہ رفتہ کچھ ایسے انداز میں ایک خاص سمت میں مڑتا چلا گیا کہ بیرونی ممالک کے سفر کی نوبت بہت تاخیر سے آسکی۔

گھٹی میں پڑے ہونے کی گواہی تو اس ایک واقعے سے بھی مل جاتی ہے کہ ابھی تیسری جماعت ہی میں پڑھتا تھا، اور میری عمر کا وہ ساتواں یا زیادہ سے زیادہ آٹھواں سال ہوگا جب مَیں نے بغیر کسی بزرگ کی رفاقت و نگرانی کے اپنے ہی ایک ہم عمر اور ہم جماعت کی معیت میں حصار سے دہلی تک کا سفر کر ڈالا تھا، اور دہلی کی خوب سیر کی تھی۔ اس سفر کے بہت سے گفتنی و ناگفتنی واقعات مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہیں۔ اور اب ذکر آ ہی گیا ہے تو ایک بات کا تذکرہ تو غالباً بے محل نہ ہوگا کہ اُن دنوں (یہ غالباً ۱۹۴۰ء کے جولائی یا اگست کا واقعہ ہے) دہلی میں جامع مسجد کے مشرقی جانب واقع پارک میں کوئی آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ دہلی میں مَیں اپنے چھوٹے ماموں صغیر احمد جان صغیرؔ مرحوم کے ہاں مقیم تھا۔ خود انہیں تو غالباً اس کانفرنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ اُن کی اہلیہ محترمہ مجھے ساتھ لے کر اس میں گئی تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہاں ایک مقرر نے بڑی گھن گرج کے ساتھ خطاب فرمایا تھا، اور اُن کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ اس ناسمجھی اور بے شعوری کے عالم میں بھی اس تقریر کا کچھ ایسا نقش میرے تحت الشعور میں قائم ہو گیا تھا کہ لگ بھگ بیس سال بعد غالباً ۱۹۶۰ء میں منٹگمری (حال ساہیوال) میں ایک اہل حدیث کانفرنس جامع مسجد مولوی عبدالجلیل صاحب میں منعقد ہوئی اور اس

میں میں نے اپنے شعور کے دور میں پہلی بار مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالوی مرحوم کی تقریر سنی تو وہ پرانی یاد تازہ ہوگئی اور دل و دماغ نے گواہی دی کہ یہی وہ مقرر تھے جن کی تقریر میں نے بچپن میں سنی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جب میں نے اس کا ذکر مولانا عبدالعفار حسن مدظلہ سے کیا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی کہ واقعتہً وہ تقریر مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم ہی کی تھی اور اسی تقریر نے موصوف کو آل انڈیا شہرت عطا کی تھی۔

دہلی کا یہ سفر اس اعتبار سے آسان تھا کہ ایک تو چاہے ہم عمری ہی سہی بہرحال ایک ہم سفر ساتھ تھا اور دوسرے ایک تیز رفتار گاڑی ہریانہ ایکسپریس حصار ہی سے چلتی تھی اور صرف تین یا چار جگہ ٹھہرتی ہوئی کل تین گھنٹے میں دہلی جا پہنچتی تھی۔ لیکن دو ہی سال بعد جبکہ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی دعوت پر جو اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں زیر تعلیم اور ریواز ہاسٹل میں مقیم تھے، میں نے بالکل تن تنہا لاہور کا سفر کیا۔ یہ سفر اس اعتبار سے زیادہ مشکل تھا کہ اس میں راستے میں بھٹنڈا ریلوے اسٹیشن پر گاڑی بھی بدلنی تھی۔ اور حصار سے جس گاڑی سے میں روانہ ہوا وہ وہیں سے چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوئی تھی۔ گویا بھٹنڈا میں جو گاڑی مجھے لینی تھی، اُس کے ملنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ مجھے پوری رات بھٹنڈا ریلوے اسٹیشن ہی پر بسر کرنی پڑی اور میں ایک دن کی تاخیر سے لاہور پہنچ سکا، اور اس اثناء میں لاہور سے حصار اور حصار سے لاہور تاروں کا تبادلہ بھی ہوا اور میری گمشدگی کی اطلاع بھی لاہور پولیس کے ہاں درج ہوگئی۔

سیر و سفر کے اسی پیدائشی شوق کا نتیجہ تھا کہ ہائی سکول کا پورا عرصہ ایسے بیتا کہ جیسے ہی گرمیوں کی تعطیلات قریب آتی تھیں سفر کے پروگرام بننے شروع ہو جاتے تھے۔ کسی سال لاہور کا رُخ ہوتا تھا بھائی جان کے پاس آنے کے لئے، اور کسی سال دہلی کا ماموں جان کے یہاں۔ بلکہ اس میں اضافہ یہ ہوا کہ چونکہ بڑے ماموں محکمہ ریلوے میں ملازم تھے اور اُن کی تعیناتی بالعموم بی بی اینڈ سی آئی آر (B.B. & C.I.R) کے وسط ہند کے جانب کے سٹیشنوں پر ہوتی تھی — لہٰذا ہماری سیر کا دائرہ بھرت پور، آگرہ، گنگا پورہ اور دریائے چنبل پر واقع ایک حسین شہر کوٹہ بوندی تک وسیع ہوگیا تھا۔

اس وسیع تر دائرے کے علاوہ تھا ضلع حصار کے تحصیل ہیڈ کوارٹرز یعنی ہانسی اور سرسہ کے سفر کا سلسلہ جو کچھ عزیزوں سے ملنے کے لئے اور کچھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی

توسیع و تنظیم کے ضمن میں مسلسل جاری رہتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ جو چھٹی بھی بغیر سفر گذرتی تھی، اس کے خالی خالی سے گذر جانے کا شدید احساس ہوتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ معاملہ وہی ہو کہ

"ہر صبح سفر، ہر شام سفر ❊ اس زندگی کا ہے نام سفر!"

جولائی اگست ۱۹۴۶ء کے ایک یادگار سفر کا ذکر بھی اس مرحلے پر بے محل نہ ہوگا۔ یہ سفر میں نے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیت میں کیا تھا۔ سبب سفر یہ تھا کہ پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد صاحب (مرحوم) کے بارے میں یہ فیصلہ کہ انہیں انجینیرنگ اسکول رسول میں داخل کرایا جائے۔ بعض وجوہات سے بہت تاخیر سے ہو سکا تھا اور اب درخواست داخلہ کی مدت ختم ہو رہی تھی اور بذریعہ ڈاک درخواست کی ترسیل کی کوئی صورت نہ تھی۔ صرف ایک امکان تھا کہ کوئی سفر کر کے وہاں جائے اور خود درخواست پہنچا دے: "اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں!" کے مصداق ہمیں اور کیا چاہیئے تھا۔ چنانچہ بھائی جان اور میں عصار سے چلے اور منڈی بہاؤالدین پہنچے۔ وہاں سے جو ٹرالی روزانہ رسول جایا کرتی تھی، ہماری ٹرین کے لیٹ ہو جانے کے باعث وہ نکل گئی تھی۔ چنانچہ ہمیں لگ بھگ نو میل کا فاصلہ تقریباً دوڑتے ہوئے طے کرنا پڑا۔ تاہم درخواستِ داخلہ بروقت داخل کرا دی گئی۔ اسی سفر میں ہم نے رسول ہیڈ ورکس کی بھی سیر کی اور کھیوڑہ کی نمک کی کان کو بھی خوب دیکھا ——— اور پھر واپسی پہ اچانک خیال آیا اور لاہور سے جانب پٹھانکوٹ رُخ کر لیا۔ اور دو دن "دارالاسلام" میں بسر کئے جس کا تفصیلی ذکر ان شاء اللہ پھر کبھی آئے گا۔

اس سے قبل ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ایک سفر لاہور کا اور بھی کر چکا تھا جس کے دوران میں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک بڑے جلسے میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کی تھی، جس سے جبیبیہ ہال اسلامیہ کالج میں مؤسسِ پاکستان محمد علی جناح مرحوم نے خطاب فرمایا تھا۔

۱۹۴۷ء کے ماہ جولائی میں مجھے حصار سے پھر لاہور آنے کا موقع ملا۔ اور اس بار سفر کار سے ہوا۔ اس وقت کے ضلعی سربراہ یعنی ڈپٹی کمشنر اور آج پورے ملک کی عدلیہ کے سربراہ یعنی چیف جسٹس آف پاکستان شیخ انوار الحق صاحب کی معیت میں، ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو میں نے لاہور ہی میں اپنا میٹرک کا رزلٹ سُنا۔ بڑے بھائی ان دنوں انجینیرنگ کے آخری سال

کا امتحان دے رہے تھے۔ وہ فارغ ہوئے تو ہم دونوں نے براستہ امرتسر و لدھیانہ حصار کا سفر کیا۔ یہ پورا علاقہ سکھوں کا گڑھ تھا، اور اس وقت قومی و مذہبی منافرت عروج پر تھی اور اعصاب میں شدید تناؤ پیدا ہو چکا تھا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ پورا راستہ ہم دونوں بھائی ہندوؤں اور سکھوں کی خشمگیں نگاہوں کا ہدف بنے رہے تھے ــــ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان تجربات سے گذر چکنے کے بعد بھی "سیلانی طبیعت" نے زور لگایا اور میں ۱۹۴۷ء کی عیدالفطر کے موقع پر پھر دہلی میں تھا اور دوگانۂ عید دہلی کی تاریخی عیدگاہ میں ادا کر رہا تھا۔ وہاں سے جونہی حصار واپسی ہوئی ہندوؤں کے حملے شروع ہو گئے اور ہم حصار میں 'محصور' ہو گئے۔

ڈیڑھ ماہ سے کسی قدر زائد محصوری کے بعد وہ تاریخی سفر شروع ہوا جسے اپنی زندگی کے لانگ مارچ (MARCH) سے تعبیر کروں تو غلط نہ ہوگا۔ حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا سفر ایک پیدل قافلے کے ساتھ پورے بیس دنوں میں۔ جس کے دوران پیش آمدہ حالات و واقعات کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور جس کی صعوبتیں اور مصیبتیں ناقابلِ بیان ہیں، تاہم جس کا حاصل یہ ہوا کہ: ؎

شکر، صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!

یعنی تحریک پاکستان کے ایک ادنیٰ اور ننھے کارکن کو پاکستان پہنچنا نصیب ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے ابتدائی دو سالوں کے دوران والد مرحوم کی تعیناتی تو اوّلاً لاہور پھر قصور، پھر پتوکی اور بالآخر منٹگمری (حال ساہیوال) میں ہو گئی اور بھائی جان بحیثیت ایس ڈی او محکمہ انہار چیچہ وطنی، پاکپتن، دیپالپور ہوتے ہوئے ہرنولی (تحصیل ضلع میانوالی) پہنچ گئے۔ جب کہ میں لاہور میں گورنمنٹ کالج میں برائے تعلیم اور کرشن نگر میں مقیم رہا۔ اس عرصے کے دوران پنجاب کے متذکرہ بالا شہروں اور قصبوں کے مابین ہی آمد و رفت جاری رہی اور کوئی طویل سفر نہ ہو سکا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تحریکِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ ایک نیم شعوری لیکن گہرا قلبی تعلق قائم ہو گیا تھا اور اب توجہ کا اصل مرکز تحریک اور اس کے دعوتی و تنظیمی اُمور تھے نہ کہ سیر و سفر۔

پاکستان میں پہلا طویل سفر اواخر ۱۹۵۱ء میں کراچی کا ہوا۔ جہاں جماعتِ اسلامی کا کُل پاکستان سالانہ اجتماع منعقد ہوا تھا۔

اس کے فوراً بعد میرے کاندھوں پہ اسلامی جمعیت طلبہ کی گوناگوں ذمہ داریاں آگئیں اور میری تگ و دو اور دوڑ دھوپ اور لامحالہ سفر کا دائرہ پورے مغربی پاکستان کو محیط ہوگیا۔ ۱۹۵۳ء کا ایک یادگار سفر بالاکوٹ کا تھا۔ ان دنوں شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی کسی تحریر میں جماعتِ اسلامی کے بارے میں لکھ دیا تھا کہ "کیا عجب کہ یہ تحریک بھی جو پٹھان کوٹ سے شروع ہوئی ہے، کسی بالاکوٹ پر ختم ہوجائے!" — اس پر دل سے ایک ہُوک سی اٹھی اور میں فوراً چند رفقاء کے ہمراہ بالاکوٹ جا پہنچا اور شہیدینؒ کی قبروں کی جا زیارت کی۔ واپسی پر پرانی "سیلانی طبیعت" نے جوش مارا تو ایبٹ آباد سے مری تک پیدل سفر کیا۔ اور ہمالیہ کے ایک حقیر سے گوشے ہی کو سہی، بہرحال اپنے قدموں تلے پامال کرنے کا فخر حاصل کرلیا۔

بالاکوٹ کو بجا طور پہ وادیٔ کاغان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تو صرف اس دروازے ہی کی زیارت ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد پہاڑوں سے بالعموم اور وادیٔ کاغان سے بالخصوص عشق کا ایک رشتہ قائم ہوا جو تاحال شدّت کے ساتھ برقرار ہے۔ چنانچہ اس پورے عرصے کے دوران دوسرے، تیسرے سال لازماً وادیٔ کاغان کا چکّر ضرور لگا لیتا ہوں اور کم از کم ناران تک ضرور ہو آتا ہوں، خواہ وہاں قیام صرف ایک رات ہی کا ہوسکے ——— (گذشتہ سے پیوستہ سال جب محبّی فرید احمد محبوب ترمذی صاحب نے 'نیپا' NIPA کے ایک گروپ کے ساتھ گلگت اور ہنزہ وغیرہ کے سفر کی دعوت دی تو اسی عشق کے ناطے میں نے فوراً لبّیک کہی اور اس طرح "دُنیا کی چھت" کے ایک حصّے کی بھی سیر کرلی۔)

۱۹۵۵ء کے ایک یادگار سفر کا ذکر کئے بغیر بھی گذرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُن دنوں میں جماعت اسلامی منٹگمری کا امیر تھا، اور جماعت کا کل پاکستان سالانہ اجتماع پھر کراچی ہی میں منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے جماعت کے مقامی ارکان اور احباب کے ساتھ 'باجماعت' سفر کا پروگرام بنایا اور لوگوں کے احتجاج کے باوجود طے کیا کہ سفر بجائے میل یا ایکسپریس ٹرین کے پسنجر سے ہوگا۔ جب اسٹیشن پر ٹکٹ خریدنے کا مرحلہ آیا تو ریلوے والوں کو بھی حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا کہ آج تک کوئی شخص کراچی پسنجر سے نہیں گیا۔ لہٰذا مطبوعہ ٹکٹ تو موجود نہیں ہیں البتہ خصوصی ٹکٹ بنائے دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سفر میں

اس وقت کی انٹر کلاس (جس کا کرایہ میل کی تھرڈ کلاس ہی کے لگ بھگ تھا) میں ہمیں وہ آرام ملا جو میل کی فرسٹ کلاس میں نہ ملتا۔ اور پُورا سفر پکنک کی سی کیفیت میں گذرا۔ اگرچہ منٹگمری سے کراچی تک تاریخیں تین تبدیل ہوگئیں۔!!

اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدگی ہوئی تو اس کے بعد سے لگ بھگ دو سال تک کسی 'نئی تعمیر' کی تلاش و جستجو میں "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" پر عمل ہوتا رہا۔ اب کبھی لاہور آنا ہوتا تھا مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں، کبھی لائلپور (حال فیصل آباد) حکیم عبدالرحیم اشرف کے پاس، کبھی رحیم آباد جانا ہوتا تھا سردار محمد اجمل خاں لغاری کے یہاں، کبھی سکھر وہاں کے رفقاء سے ملاقات کے لئے، اور کبھی کراچی وہاں کے دوستوں بالخصوص ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی صاحب سے ملنے کی غرض سے۔ حتیٰ کہ ایک بار تو منٹگمری سے پریکٹس کی بساط لپیٹ کر بوریے بستر سے اور اہل و عیال سمیت کراچی جانا ہوگیا۔ لیکن جیسا کہ قارئینِ 'میثاق' کے علم میں ہے اس دشت نوردی اور بادیہ پیمائی سے حاصل کچھ بھی نہ ہو سکا۔

اپریل ۱۹۶۲ء میں میرا پہلا غیر ملکی سفر ہوا ـــــ اور الحمدللہ کہ یہ "سفر مقدّس" تھا۔ یعنی برائے حج بیت اللہ و زیارتِ مسجد نبوی علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کراچی سے جدّہ بذریعہ ہوائی جہاز جس دن روانگی ہوئی، وہ میری تیسویں سالگرہ کا دن تھا، یعنی ۲۶/اپریل ۱۹۶۲۔ حج تو بحمداللہ اس کے بعد بھی کئی بار نصیب ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مرتبہ جو لطف آیا تھا وہ پھر کبھی نہ آیا۔ ایک تو شاید اس لئے کہ والدین کی ہمراہی کی سعادت حاصل تھی۔ چنانچہ والد مرحوم و مغفور بھی ساتھ تھے اور والدہ ماجدہ مدّ ظلہا بھی۔ دوسرے اس لئے کہ ابھی ازدحام کی وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی جو اب ہوگئی ہے۔ اور منیٰ میں قیام کے دن واقعتہً "ایّامِ اکل و شرب" اور حالِ کیف و سرور ہوتے تھے۔ واللہ اعلم۔!!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک ایک بالکل دوسری نوعیّت کے سفر کا تجربہ ہوا۔ اس دوران میں مَیں نے بھائی جان کی دعوت پر اُن کے تعمیراتی کاروبار میں شرکت اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا اب کاروباری سفروں کا چکّر چلا۔ چنانچہ کیماڑی سے تورخم تک سڑک کو بھی بارہا ناپنے کا موقع ملا۔ اور غالباً مغربی پاکستان کا کوئی ہوائی اڈّہ بھی باقی

نہ رہا جہاں ہوائی جہاز سے اترنے یا چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے لگ بھگ دس سال بعد اوائل ۱۹۶۶ء میں میں ایک نئے عزم و ارادے کے ساتھ دوبارہ واردِ لاہور ہوا۔ اور جیسا کہ اکثر رفقاء و احباب کے علم میں ہے، یہیں سے میری زندگی کے نئے دَور کا آغاز ہوا۔ الحمدللہ کہ پورے چار سال میں نے لگ لپیٹ کر پوری تندہی سے کام کیا۔ اور نہایت مختلف النوّع بلکہ متضاد ذمہ داریوں کو نباہا ——— چنانچہ ایک جانب میڈیکل پریکٹس تھی اور دوسری جانب "دارالاشاعت الاسلامیہ" کا قیام، حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا اجراء اور 'میثاق' کی ادارت ——— نتیجۃً ان دِنوں سفر کی نوبت کم ہی آئی۔ اور ارضِ لاہور ہی تمام تر توجہات کا مرکز بنی رہی۔

البتہ جب 'میثاق' کے بعض مضامین کے نتیجے میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے حلقے میں کچھ حرکت پیدا ہوئی تو پھر کراچی، سکھر، رحیم آباد اور رحیم یار خاں کے بعض سفر ہوئے۔ جن کے نتیجے میں اوّلاً "قراردادِ رحیم آباد" وجود میں آئی اور پھر "اجتماعِ رحیم یار خان" منعقد ہوا۔ نتیجۃً 'تنظیم اسلامی' کی 'نشأۃِ اُولیٰ' ہوئی۔ اور اس کے ضمن میں ایک یادگار سفر مولانا امین احسن اصلاحی کی معیّت میں ہوا۔ چنانچہ لاہور سے بذریعۂ کار ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خاں اور رحیم آباد ہوتے ہوئے ہم دونوں سکھر پہنچے۔ جہاں سے مولانا بذریعہ ریل کراچی تشریف لے گئے اور میں نے بقیہ سفر بھی کار ہی سے طے کیا۔ لیکن افسوس کہ بعض حوادث کی وجہ سے جن میں سے ایک اسی سفر کے دوران بمقام سکھر پیش آیا تھا۔ 'تعمیرِ نو' کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

وسط ۱۹۷۰ء میں متذکرہ بالا دو طرفہ بلکہ متضاد مصروفیات کی کھینچ تان اور کام کے بوجھ کی وجہ سے میری صحت خراب ہو گئی تو میں نے بحالیٔ صحت کے لئے اوّلاً بھائی جان کے یہاں جوہر آباد میں پندرہ دن آرام کیا۔ اور پھر خالص سیر اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے ایک سفر محترم اسرار الحق[1] کی دعوت پر بھائی جان کی معیّت میں مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کا کیا۔ آٹھ دن کے اس 'طوفانی سفر' میں ہم نے نہ صرف یہ کہ ڈھاکہ، کومیلا، چاٹگانگ اور کاکس بازار تک کی سیر کی۔ بلکہ شمال میں چائے کے باغات بھی دیکھے اور پھر سٹیمر کے ذریعے ایک سفر چاند پور سے کھلنا تک کا کیا (اور

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں!

یہی تاحال راقم کا واحد بحری سفر ہے!)

دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے پہلے عام انتخابات کا انعقاد طے تھا، ادھر ملک میں سیاسی افراتفری عروج پر تھی۔ چنانچہ دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم شدّت اختیار کر چکی تھی۔ اور مذہبی جماعتوں میں سے بھی دو اسی بنیاد پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں۔ یعنی ایک جانب جماعت اسلامی اور دوسری جانب جمعیّۃ علماء اسلام۔ اس موقع پر بعض اسباب کی بنا پر جمعیّۃ العلماء کی جانب سے مجھ پر زور پڑا کہ ہمارے ٹکٹ پر الیکشن لڑو۔ میں اپنی کمزوریٔ طبع کی وجہ سے صاف جواب تو نہ دے سکا۔ البتہ ایک طویل عرصے کے لئے ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ میری زندگی کا تاحال طویل ترین سفر ہے، جس میں میں اپنے مستقر سے پورے ۱۲۰ دن (تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلّے) غیر حاضر رہا۔

اس سفر کے دوران پورا ماہِ رمضان مبارک میں نے مدینہ منوّرہ میں مسجد نبوی اور روضۃ النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ٹھنڈی چھاؤں اور مولانا عبدالغفّار حسن مدّظلّہٗ کے سایۂ عاطفت میں گذارا۔ اور یوں تو پورا مہینہ ہی کیف و سرور کے عالم میں گذرا لیکن بالخصوص آخری عشرہ اور اس کے دوران مسجد نبوی کے "قیام اللّیل" کی لذّت کو تو واقعہ یہ ہے کہ میں نہ اب تک بھول سکا ہوں، نہ غالباً آئندہ کبھی بھول سکوں گا۔

ے موصوف اس وقت مشرقی پاکستان پی ڈبلیو ڈی میں غالباً ڈپٹی چیف انجینئر تھے۔ اور ان کے ساتھ میری نام کی مشابہت کے علاوہ ہمارے خاندانوں میں بھی بہت سی دوسری مشابہتیں موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم بھی پانچ ہی بھائی ہیں اور وہ بھی۔ ان کے یہاں سب سے بڑے اظہار الحق ہیں اور ہمارے یہاں اظہار احمد۔ ان پانچ میں سے بھی تین انجینئر ہیں اور ہمارے یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ اُن میں سے بھی ایک ڈاکٹر ہیں اور ادھر میں نے بھی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اگرچہ اس کا ساتھ زیادہ دیر تک نہ دے سکا۔ پھر عجیب اتفاق یہ کہ ہم دونوں کلاس فیلو بھی تھے۔ آخری، اور اہم ترین مشابہت یہ کہ ان کے بھی سب سے چھوٹے بھائی انتصار الحق نے فلسفے میں پی ایچ ڈی کیا اور ہمارے بھی سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد ہیں جنھوں نے فلسفے ہی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ پھر ان دونوں کے ناموں میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے۔ الغرض۔ ع: "اتفاقات ہیں زمانے کے!"

اس کے بعد ایک ماہ کے لئے مَیں برادرِ عزیز الصالح احمد سلّمہٗ کی دعوت پر، جو، اُن دنوں وہاں پی ایچ ڈی کی تکمیل کر رہے تھے، لندن گیا ـــــ اور یہ "دیارِ مغرب" اور "تہذیب حاضر" کے ساتھ میرا "قصّۂ زمین برسرِ زمین!" کی نوعیّت کا پہلا معاملہ تھا ـــــ واپسی پر بلجیم کے ایک نومسلم نوجوان عبدالعزیز وان کینیٹر کی ملاقات کے لئے دو دن برسلز میں رکا ـــــ اور پھر حج بیت اللہ سے دوسری بار مشرّف ہونے کے ارادے سے واپس حجاز آ گیا، اور وہیں مَیں نے زندگی کا اہم ترین فیصلہ کیا ـــــ یعنی اب پریکٹس کو خیر باد ـــــ اور کل وقتی توّت وقف برائے خدمت کتاب اللہ و اعلاءِ کلمۃِ اللہ ـــــ !!

الغرض اس سفر میں مَیں نے بقول حضرتِ اکبر اوّل و آخر تو "خدا کا گھر" دیکھا اور اس کے درمیان کچھ "خدا کی شان" بھی دیکھ لی۔

میری ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کی مصروفیات کا علم قارئینِ 'میثاق' کی اکثریّت کو بخوبی حاصل ہے۔ اس دوران میں اندرونِ ملک سفر تو گویا زندگی کے مستقل لوازم میں شامل رہا۔ 'دعوت رجوع الی القرآن' کے 'داعی' اور 'تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن' کے 'محرّک' کی حیثیّت سے ملک کے طول و عرض میں میری نقل و حرکت بہت سوں کے لئے قابلِ حیرت رہی ہے تو بہت سوں کے لئے باعثِ رشک ـــــ بلکہ بعض کے لئے بنائے حسد بھی! تاہم اس کا مفصّل ذکر تو کیا اجمالی جائزہ بھی نہ یہاں مطلوب ہے نہ ممکن ـــــ البتّہ اس کے 'اوّل و آخر' کا ذکر مناسب رہے گا ـــــ یعنی ۱۹۷۲ء کے پورے بارہ مہینے مَیں نے ہر ماہ کراچی کا سفر کیا اور راستے میں اکثر سکھر، صادق آباد، رحیم یار خاں اور ملتان میں سے ہر ماہ کم از کم تین مقامات پر رکنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور یہ سب سفر ریل سے ہوئے اور اس کی تھرڈ کلاس میں (سوائے آخری ایک یا دو ماہ کے کہ ان میں بعض احباب کے اِصرار پر ایک جانب کا سفر ہوائی جہاز سے ہوا۔) اور اب گذشتہ تین چار سال سے حال یہ ہے کہ ٹرین سے سفر کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی پچھلے دنوں بذریعہ ریل ساہیوال جانا ہوا تو ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت پرانی بھولی بسری یاد تازہ ہوئی ہو۔

اس عرصے میں بیرونِ ملک سفر دو بار حجازِ مقدّس ہی کے ہوئے۔ ایک ۱۹۷۴ء

میں اپنی اہلیہ اور چچی صاحبہ اور رفیق مکرم ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب اور ان کی اہلیہ کی معیت میں حج کے لئے ـــــ اور دوسری بار ۱۹۷۶ء میں ساہیوال کے حاجی عبدالمجید صاحب کی معیت میں بغرضِ عمرہ ـــ!

امریکہ میں ڈیڑھ ماہ

لاہور اور کراچی میں درسِ قرآن کی مجالس میں بارہا ایسا ہوا کہ درس کے بعد کوئی صاحب ملے اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں بلادِ عرب میں کسی جگہ یا افریقہ و یورپ کے کسی ملک یا امریکہ میں کسی مقام پر رہتا ہوں، جہاں ہماری ہندو پاکستان سے آمدہ مسلمانوں کی کوئی سوسائٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کر دیا کہ اگر ہم اُس سوسائٹی کی جانب سے آپ کو وہاں آنے کی دعوت دیں تو کیا آپ وقت نکال سکیں گے؟ جواب میں میں غور کرنے کا وعدہ کر کے ٹالتا رہا۔ اس لئے کہ اکثر و بیشتر اندازہ یہی ہوا کہ یہ کسی وقتی سے تأثر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کی پشت پر کوئی سنجیدہ ارادہ موجود نہیں ہوتا ـــــ اسی طرح کا کوئی معاملہ لاہور میں وسط ۱۹۷۸ء میں بالٹی مور (امریکہ) سے آئے ہوئے ایک ماہر امراضِ چشم ڈاکٹر شوکت علی صاحب سے ہوا۔ لہٰذا میں نے اسے بھی کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر ایسا ہی معاملہ کراچی میں جناب سمیع اللہ صاحب مقیم ٹورنٹو (کینیڈا) سے ہوا۔ اور اگرچہ وہ بہت ہی مستعد بھی نظر آئے اور سنجیدہ بھی، اور انہوں نے میری حقیری تالیفات سے بھی بہت دلچسپی لی، اور میرے دروس کے TAPES بھی بہت سے منگوائے تاہم یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ اُن کی تحریک پر امریکہ کے سفر کی کوئی صورت جلد بن جائے گی لیکن ہوا یہ کہ ایک طرف تو جلد ہی ڈاکٹر شوکت علی (صدر) اور ڈاکٹر جاوید شفیع (سیکرٹری) کے دستخطوں سے اسلامی سوسائٹی آف بالٹی مور (میری لینڈ) کی جانب سے باضابطہ دعوت نامہ موصول ہو گیا۔ اور دوسری جانب ٹورنٹو میں سمیع اللہ خاں صاحب کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں اور کچھ مطبوعات اور زیادہ تر دروسِ قرآن اور تقاریرِ سیرت کے TAPES کے ذریعے وہاں ایک وسیع حلقۂ تعارف پیدا ہو گیا اور ان کی جانب سے بھی کینیڈا کے دورے کی شدید خواہش کا اظہار شروع ہوا۔ اس سب کے باوجود میں اس معاملے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ رہا تھا کہ اچانک بالٹی مور کی اُس سوسائٹی کی جانب

سے ایک دوسرا دعوت نامہ ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی تازہ انتخاب ہوا ہے اور نئی مجلسِ منتظمہ نے سابقہ منتظمہ کی دعوت کی پُرزور تجدید کی ہے۔ نئے صدر عظیم الرحمٰن خاں صاحب کی جانب سے یہ نیا دعوت نامہ ایسا پُرزور تھا کہ مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ اب رختِ سفر باندھ ہی لیا جائے۔ چنانچہ سمیع اللہ خاں صاحب کو بھی مطلع کر دیا گیا کہ وہ باقی امور سے رابطہ قائم کر کے کوئی مشترکہ پروگرام ترتیب دے لیں۔ اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ سارے مراحل بہت تیزی سے طے ہو گئے، اور اُدھر فوراً بالمشافہ مورسے پی آئی اے کا ایک دوطرفہ ٹکٹ موصول ہو گیا۔ اور اِدھر یو ایس اے اور کینیڈا دونوں کے ——— MULTIPLE VISITS کے ویزے مل گئے۔ گویا رکاوٹ کوئی باقی نہ رہی۔

لاہور سے روانگی ہفتہ ۱۸ر اگست ۱۹۷۹ء کو شام کے ساڑھے چار بجے پی آئی اے سے ہوئی۔ اور ۱۹ر اور ۲۰ر دو دن کراچی میں قیام کے بعد ۲۰ر اور ۲۱ر کی درمیانی شب کو (فنّی اعتبار سے ۲۱ر کو صبح ڈیڑھ بجے) پی آئی اے کے D.C.10 طیارے کے ذریعے جانبِ مغرب روانگی ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کی پرواز کے بعد طیارہ دوبئی کے ہوائی اڈّے پر اترا اور وہاں لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ قیام کے بعد مزید تین گھنٹے ۲۵ منٹ میں قاہرہ پہنچا۔ اس پورے عرصے میں محسوس ایسے ہوتا رہا جیسے ہم آگے آگے بھاگ رہے ہوں اور سورج ہمیں پکڑنے کی کوشش میں پیچھے پیچھے دوڑا چلا آ رہا ہو۔ نتیجہ یہ کہ دورانِ پرواز تو وہ ہمیں نہ پکڑ سکا، البتہ قاہرہ ایئرپورٹ پر اس نے آ ہی لیا۔ (اس وقت کراچی میں سورج طلوع ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے!)۔ قاہرہ ائرپورٹ پر نامعلوم کس وجہ سے ہمارا جہاز بھی ٹرمینل بلڈنگ سے بہت فاصلے پر کھڑا رہا اور کسی کو باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ ایک گھنٹے بعد وہاں سے روانگی ہوئی تو اندازہ ہوا کہ قاہرہ شہر بہت بڑا بھی ہے اور نہایت جدید بھی۔ بہرحال اب ہمارا رُخ جانبِ شمال تھا۔ اور تین گھنٹے ۵۰ منٹ کی پرواز کے بعد فرینکفرٹ پہنچنا ہوا۔ وہاں بھی ایک گھنٹہ قیام رہا اور پھر کُل ۴۵ منٹ کی پرواز نے پیرس پہنچا دیا۔ جہاں پھر ایک ہی گھنٹہ قیام رہا۔

وسطی یورپ کے اِن دو ہوائی مستقروں پر نزول وصعود کے وقت کی نیچی پرواز کے دوران جرمنی اور فرانس کے جو علاقے نظر آئے اُن کی سرسبزی اور شادابی بھی حد درجہ

دل کو لبھانے والی محسوس ہوئی، اور دونوں شہروں کے فضائی نظارے اور ہوائی اڈوں کی وسعت و عظمت، چہل پہل اور حُسنِ انتظام سے مشرق و مغرب کا فرق بھی پوری طرح واضح ہوگیا۔

پیرس سے TRANS-ATLANTIC پرواز شروع ہوئی تو اب معاملہ برعکس ہوگیا۔ یعنی سورج ہمارے آگے آگے تھا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے وہ غریب دن بھر کے طویل سفر کا تھکا ماندہ غروب ہونے کی فکر میں ہو تاکہ رات کی تاریکی میں آرام کرسکے اور ہم ڈنڈا لئے اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہوں کہ تجھے ڈوبنے نہ دیں گے۔ پورے آٹھ گھنٹے تک یہ تعاقب جاری رہا، یہاں تک کہ جب ہمارا جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُتر کر ساکن ہوگیا، تب سورج کو بھی مہلت ملی کہ جلدی سے بسترِ افق میں گھُس کر رات کی تاریکی کی چادر تان لے۔ وقت کا گورکھ دھندا ملاحظہ ہو کہ ہم پیرس سے چلے تو وہاں کے مقامی وقت کے مطابق سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے — اور جب آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد نیویارک پہنچے تو وہاں ابھی شام کے صرف ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اور اِدھر پاکستان میں تاریخ بدل چکی تھی اور کراچی میں رات کے ڈھائی بجے کا سماں تھا۔

کسٹم اور امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہوکر انٹرنیشنل ونگ سے باہر آیا، اور لوکل ایئرلائنز میں سے ALLEGHENNY ایئرلائن کے ٹرمینل پر پہنچا۔ وہاں سے دو گھنٹے بعد پرواز مل گئی جس نے کُل ۴۵ منٹ میں بالٹی مور واشنگٹن انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لا اُتارا۔ اس وقت وہاں ۲۱ اگست کی رات کے ساڑھے نو بجے کا عمل تھا، جبکہ کراچی میں ۲۲ کی صبح کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

اور اسی فرق نے میرے لئے بڑی مشکل پیدا کردی۔ رفیقِ مکرّم قاضی عبدالقادر صاحب نے جو تار میری آمد کے سلسلے میں بالٹی مور دیا تھا اس میں غالباً پرواز کے گھنٹوں (FLYING HOURS) کا حساب کتاب جوڑ کر میری آمد کی تاریخ ۲۲ درج کردی تھی، لہٰذا میں اپنے میزبانوں کی توقع سے ایک دن قبل پہنچ گیا۔ اِدھر میں پوری طرح مطمئن تھا کہ کوئی نہ کوئی ایئرپورٹ پر ضرور آجائے گا۔ چنانچہ پہلے تو میں امیگریشن میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر چار و ناچار اپنا سامان لے کر باہر آیا کہ شاید کوئی وہاں

منتظر ہو تو وہاں ہُو کا عالم پایا۔ اب "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن!" قاضی صاحب نے کتابوں کے بھی بھاری بھاری بنڈل ساتھ کر دیئے تھے، لہٰذا سامان کافی تھا۔ اب نہ میں اس قابل تھا کہ اسے چھوڑ کر کہیں بھاگ دوڑ کر سکوں، اور نہ ہی اس "غیر کی بستی" میں سڑک کے کنارے سامان سمیت کھڑے رہنے میں کوئی معقولیت نظر آتی تھی۔ ادھر جیب میں فارن ایکسچینج اب تک صرف ٹریولرز چیکس کی صورت میں تھا۔ گویا نہ تو کل کرنسی ہی تھی نہ ریزگاری۔ ایک پورٹر سے درخواست کر کے عظیم الرحمٰن خاں صاحب کے گھر فون کرایا تو معلوم ہوا کہ اُن کا گھر سکار بروکورٹ آرنلڈ میں ہے جو وہاں سے لگ بھگ تیس میل دُور ہے اور خود وہ اس وقت بالٹی مور کے وسط شہر (DOWN TOWN) میں واقع اسلامی مرکز میں تراویح پڑھنے گئے ہیں، جس کا فاصلہ اُن کے گھر سے کوئی بیس میل ہے، اور وہاں آج ختمِ قرآن بھی ہے۔ لہٰذا فراغت روزانہ کے مقابلے میں تاخیر سے ہوگی۔ گویا تین چار گھنٹے سے قبل اُن کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے ـــــ چنانچہ چار و ناچار نہایت بے بسی کے عالم میں یہ چار گھنٹے ایئرپورٹ پر انتظار میں بسر کئے۔ تا آنکہ وہ واپس گھر پہنچے اور اُن کے علم میں بات آئی تو انہوں نے عقلمندی کی اور ایئرپورٹ سے نسبتاً قریب رہنے والے رفیق سیّد ساجد حسین صاحب کو فون کر دیا جو عبدالقیوم صاحب کی معیّت میں فوراً ایئرپورٹ پہنچے اور مجھے گلن برنی میں واقع اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں پہنچ کر وقت دیکھا تو رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ بہرحال یہ اطمینان تھا کہ کسمپرسی کا عالم ختم ہوا اور اب خواہ 'دیارِ غیر' ہی میں سہی تاہم اپنوں کے ہاتھوں میں ہوں۔ اس وقت یہ شعر بہت مناسبِ حال محسوس ہوا کہ :

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ❊ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!

بالٹی مور ـــ واشنگٹن بالٹی مور اور واشنگٹن کے مابین اگرچہ ساٹھ ستّر میل کا فاصلہ ہے، لیکن امریکہ کے حساب سے انہیں TWIN CITIES قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی انٹرنیشنل ایئرپورٹ مشترکہ ہے جو دونوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ اس علاقے میں میں پورے دن گھومتا رہا۔ یعنی ۲۲ اگست تا یکم ستمبر ـــ اس دوران میرا قیام زیادہ تر سیّد ساجد حسین صاحب کے مکان پر رہا۔ یہ یوپی کے ضلع فتح پور سے تعلق رکھتے ہیں

ان کے دادا گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے، اور انہوں نے ذاتی محنت سے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے بچّی مراسم مولانا محمّد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے اعاظم رجال سے تھے۔ پاکستان آکر انہیں نہایت نامساعد حالات کا سامنا رہا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح عزّت و وقار کے ساتھ دن گذار لئے۔ ان کے بیٹے اور ساجد صاحب کے والد ماجد آج کل کراچی میں نارتھ ناظم آباد میں مقیم ہیں اور خود ساجد صاحب کئی سال سے امریکہ میں ہیں۔ اُس وقت وہ ایک ادویہ سازی کی فرم میں کام کر رہے تھے، لیکن ڈومینکن ریپبلک میں میڈیکل کالج میں داخلہ لے چکے تھے اور کچھ ہی دنوں میں وہاں جانے والے تھے۔ اُن دنوں ان کے ساتھ ہی عبدالقیوم صاحب بھی مقیم تھے، جن کا تعلّق حیدرآباد دکن سے ہے۔ اور جو بالٹی مور کی میونسپل کمیٹی میں کسی اچھّے عہدے پر فائز ہیں۔ اتّفاق سے ان دونوں حضرات کے بچّے اُن دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے۔ نتیجۃً اُن کا "خانۂ خالی" "غریب الدّیار" لوگوں کی قیام گاہ بن رہا تھا۔ اُن کے یہاں جو بستر مجھے ملا، معلوم ہوا کہ اسی پر مجھ سے کچھ ہی دن پہلے جناب نعیم صدّیقی اور ان سے چند روز قبل برادرم خرّم جاہ مراد سوتے رہے ہیں۔ سیّد ساجد حسین اور جناب عبدالقیّوم دونوں ہی نہایت مخلص مسلمان ہیں۔ اُن کی محبّت بھری مہمان نوازی عرصۂ دراز تک یاد رہے گی۔

۲۲ر اور ۲۳ر دو دن آرام کرتے ہوئے گذرے۔ ۲۲ر کی افطاری ہم سب نے عظیم الرّحمٰن خاں کے مکان پر کی۔

۲۴ر اگست کو جمعہ بھی تھا اور عیدالفطر بھی۔ عیدالفطر کی نماز میں نے بالٹی مور کے وسط شہر سے بہت قریب واقع اُس کھلے پلاٹ میں پڑھائی جو وہاں کی اسلامی سوسائٹی نے اسلامی مرکز کی تعمیر کے لئے خرید لیا ہے۔ موسم ابر آلود تھا اور ہر آن اندیشہ تھا کہ بارش شروع ہو جائے۔ لہٰذا حاضری کم تھی اور زیادہ تر لوگ DOWN TOWN میں واقع مسجد محمّد چلے گئے تھے ——— خود ہم بھی نمازِ جمعہ کے لئے وہیں گئے۔ یہ اُن سیاہ فام امریکی مسلمانوں کی مسجد ہے جو آنجہانی علی جاہ محمّد کے پیرو تھے اور جن کے موجودہ لیڈر اس کے بیٹے والیس محمّد (WALLACE MOHAMMAD) ہیں۔ جنھیں یہ لوگ 'امام' کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علی جاہ خود تو نہایت گمراہ انسان تھا اور اپنے آپ کو نبی اور رسول ہی نہیں خدا کا اوتار بھی سمجھتا تھا۔ لیکن والیس محمّد کافی حد تک صحیح رُخ پر آچکے ہیں، اور اس میں سعودی

عرب کی حکومت اور رابطۂ عالمِ اسلامی کی کوششوں کو کافی دخل حاصل ہے۔ چنانچہ سعودی عرب کی حکومت ہر سال اس کمیونٹی کے ۳۰ افراد کو اپنے خرچ پر سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے حج کراتی ہے ــــ یہاں نمازِ جمعہ تو مقامی امام صاحب ہی نے پڑھائی البتہ اس کے بعد میں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سورۂ حج کی آخری دو آیات کا درس دیا۔ــ نمازِ جمعہ کے بعد عظیم صاحب کے مکان پر احباب کا ایک اجتماع تھا۔ وہاں کی گفتگو ؤں سے اندازہ ہوا کہ سیاسی اور مذہبی میدان میں نقطہ ہائے نظر اور زاویہ ہائے نگاہ کے جو اختلافات اپنے ملک میں پائے جاتے ہیں، وہ سب یہاں بھی بہ تمام و کمال موجود ہیں۔

ہفتہ ۲۵ر اگست کا تقریباً پورا دن ڈاکٹر مشتاق صاحب کے یہاں گذرا۔ جن سے پہلی ملاقات عید کی نماز میں ہوئی تھی۔ اُن کا تعلق پاکستان میں فیصل آباد سے ہے اور وہ نہایت نیک دل اور دیندار انسان ہیں۔ بنیادی طور پر B. V. SC. تھے لیکن بعد ڈھیروں علم حاصل کیا، اور اب امریکہ کی فیڈرل سول سروس میں غذا اور ادویات کے کنٹرول کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ دفتر واشنگٹن میں ہے لیکن مکان جو نہایت کشادہ بھی ہے اور حد درجہ خوبصورت اور مرصّع و مسجّع بھی، میری لینڈ کے قصبہ فلنٹن کے نواح میں ایک پہاڑی پر بنایا ہے، جہاں سے دفتر کا فاصلہ تیس میل سے کم نہیں۔ ان کی اہلیہ جو حد درجہ سادہ مزاج خاتون ہیں اور ان کے بچّے (ایک بیٹی اور تین بیٹے) بھی بیک وقت نہایت ذہین بھی ہیں اور بہت نیک بھی ــــ واقعہ یہ ہے کہ سرزمینِ امریکہ میں اس گھرانے کو دیکھ کر شدید حیرت کا احساس بھی ہوا، اور حد درجہ مسرّت بھی حاصل ہوئی۔

مشتاق صاحب نے اپنے بعض احباب کو بھی مدعو کیا ہوا تھا اور وہ بھی بمعہ اہل و عیال آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہاں درسِ قرآن کی دو مجلسیں ہوئیں، ایک کھانے سے پہلے اور دوسری کھانے کے بعد ــــ پہلی میں سورۃ والعصر کا بیان ہوا اور دوسری میں آیۂ برّ کا۔

اتوار ۲۶ر اگست کو دس بجے صبح جان ہاپکنز یونیورسٹی بالٹی مور کے شیفر ہال میں ایک اجتماع منعقد ہوا، جس میں میں نے اوّلاً 'حقیقتِ جہاد' کے موضوع پر اُردو میں تقریر کی جس کا ترجمہ ڈاکٹر جاوید شفیع صاحب نے انگریزی میں کیا جو کسی طرح بھی اطمینان بخش نہ تھا۔ چنانچہ جب سوال جواب کا مرحلہ آیا تو میں نے خود ہی انگریزی میں جواب دینے شروع کر دیئے اور ایک مستفسر کی شوخی پر ذرا برہم ہو کر جس روانی کے ساتھ میں نے انگریزی میں تقریر کی اس

پر خود مجھے بھی شدید حیرت ہوئی اور تمام احباب کو بھی۔ ساجد صاحب، قیوم صاحب، عظیم صاحب اور مشتاق صاحب سب ہی کا کہنا تھا کہ آپ کے پاس نہ خیالات (IDEAS) کی کمی ہے نہ ذخیرۂ الفاظ (VOCABULORY) کی، پھر آپ خواہ مخواہ انگریزی میں تقریر کرنے سے کیوں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ اس پر میں نے ان سے عرض کیا کہ بھائی واقعہ یہی ہے کہ مجھے انگریزی میں گفتگو کی بالکل مشق نہیں ہے اور میں حتی الامکان اردو ہی میں خطاب کروں گا۔ تاہم نمازِ ظہر کے بعد جب دوسرا سیشن شروع ہوا تو ابتداءً میں نے پھر ترجمے کا سہارا لیا، لیکن پھر پہلی سی صورتِ حال دیکھ کر میں نے جلد ہی مترجم صاحب کو چھٹی دے دی اور انگریزی ہی میں خطاب شروع کر دیا۔ موضوع تھا: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقِ انقلاب"۔ بعد میں اس پر بھی خاصی گرما گرم بحث رہی اور بحیثیتِ مجموعی یہ دونوں اجلاس بہت کامیاب رہے۔ شام کو میں مشتاق صاحب کے مکان پر آ گیا، اور تقریباً دو دن وہیں مقیم رہا۔

پیر ۲۷ اگست کو ساڑھے سات بجے صبح مشتاق صاحب اور اُن کے دو بچوں کے ہمراہ واشنگٹن روانگی ہوئی۔ شہر کے بالکل مرکز میں واقع اُن کے دفتر تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ مشتاق صاحب تو دفتر چلے گئے اور میں نے اُن کے بچوں کے ساتھ امریکہ کے "قومی فضائی و خلائی عجائب گھر" کی سیر کی۔ دوپہر کا کھانا مشتاق صاحب گھر سے لائے تھے جو ہم نے 'قصرِ سفید' (WHITE HOUSE) کے سامنے واقع لان میں کھایا۔ اس کے بعد "طبعی تاریخ کے عجائب گھر" کا چکر لگایا۔ اسی قسم کا میوزیم میں ۷۰-۱۹۷۱ء میں لندن میں دیکھ چکا تھا اور ذہن میں تاثر یہی قائم ہوا کہ وہ اس سے بہتر تھا۔ تاہم اس میں امریکہ کے اصل باشندوں کی تاریخ سے متعلق حصہ یقیناً بہت دلچسپ بھی تھا اور معلومات افزا بھی۔

واشنگٹن سے واپسی پر نہایت طوفانی بارش ہوئی۔ چنانچہ ایک گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ شام کو عظیم صاحب کے مکان پر احباب سے ایک غیر رسمی ملاقات طے تھی، لیکن شام کے سات مشتاق صاحب کے مکان پر ہی بج گئے تھے، اور میں تھکا ہوا بھی بہت تھا۔ لہٰذا ان سے فون پر معذرت کرنی پڑی، جس کا افسوس رہا۔

منگل ۲۸ اگست کو صبح آرام کیا۔ تیسرے پہر ساجد حسین صاحب کے ہمراہ راک بری روڈ پر واقع وسیم افتخار صاحب کے مکان پر جانا ہوا۔ اُن کا تعلق بھی حیدر آباد دکن سے ہے، اور بہت درد مند مسلمان ہیں۔ انہوں نے بہت اہتمام کیا تھا اور اپنے بہت سے احباب

کو مدعو کیا تھا۔ لیکن اس روز بھی طوفانی بارشس ہوئی اور بہت کم لوگ آسکے۔ بہرحال شام کی چائے کے بعد درس کی ایک نشست ہوئی اور اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے مکان کو جاتے ہوئے ایک زیرِسمندر سرنگ سے گذرنا ہوا تو عجیب سا احساس ہوا کہ ہماری کار اس وقت لاکھوں ٹن پانی کے نیچے دوڑ رہی ہے۔

بدھ ۲۹ اگست کو واشنگٹن کا دوسرا چکر لگا۔ اور وہ اس طرح کہ صبح تقریباً آٹھ بجے ساجد صاحب کے مکان سے عظیم صاحب کے ساتھ اُن کی کار پر روانگی ہوئی۔ انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد واشنگٹن کے شمالی مضافات میں نارتھ کیرولنٹن کے اسٹیشن پر زیرِزمین ریل (METRO) میں سوار کرا دیا۔ اس طرح واشنگٹن کی SUB-WAY کی بھی سیر ہو گئی۔ دس بجے فیڈرل سنٹر سٹیشن پر مشتاق صاحب مل گئے۔ اُن کے ساتھ دو میل کا پیدل مارچ کیا اور ان ہی کی معیّت میں "قصرِ سفید" کی سیر کی۔ اس سے فارغ ہو کر یادگارِ واشنگٹن (WASHINGTON MONUMENT) پر آگئے۔ وہاں عظیم صاحب بھی دوبارہ مل گئے اور انہی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر انہی کے ساتھ MONUMENT TOWER پر چڑھنا ہوا۔ ٹاور کے اوپر سے واشنگٹن کا منظر بڑا عجیب تھا۔ وہائٹ ہاؤس، کیپیٹل بلڈنگ اور جیفرسن میموریل سب چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی مانند نظر آرہے تھے ایک جانب دریا بہتا دکھائی دے رہا تھا اور اُس کے پار واشنگٹن نیشنل ایئرپورٹ کا پورا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ الغرض خوب سیر رہی۔ شام کو عظیم صاحب ہی کے ساتھ ساجد صاحب کے مکان پر واپسی ہوئی۔

جمعرات ۳۰ اگست کو اوّل وقت آرام کیا۔ دوپہر کو وسیم صاحب آگئے اور اپنی گاڑی پر ڈاکٹر جاوید شفیع کے کلینک پر لے گئے۔ وہاں سے ان کے ہمراہ ان کے گھر جانا ہوا۔ جہاں انہوں نے بہت سے احباب کو مدعو کیا ہوا تھا۔ شام کی چائے کے بعد درس کی محفل جمی۔ سورۂ حج کی آخری دو آیات کا مفصّل درس ہوا۔

جمعہ ۳۱ اگست کو واشنگٹن کا تیسرا اور آخری چکر مشتاق صاحب ہی کی ہمراہی میں لگا۔ جہاں واپسی کے سفر کے لئے براستہ قاہرہ و جدّہ پی آئی اے سے بکنگ کرائی۔ اور نمازِ جمعہ واشنگٹن کے مشہور اسلامک سنٹر میں ادا کی۔ نماز سے قبل تقریباً نصف گھنٹہ ایک مصری قاری صاحب نے قرآنِ حکیم کی قراءت فرمائی، جس سے واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے بلادِ مغرب کے ان دس دنوں کا پیدا شدہ غبار

دل پر سے دُھل گیا ہے — اور اس طرح بالٹی مور، واشنگٹن اور ان کے گرد و نواح میں دس روزہ قیام اختتام پذیر ہوا۔ یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہوگا کہ یہ پورا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور ہر اعتبار سے انتہائی حسین و جمیل ہے!

ڈلاس امریکہ میں آباد مسلمانوں نے جو بہت سی تنظیمیں اور انجمنیں قائم کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹروں کی انجمن "اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن" (A.M.A) بھی ہے۔ اس کا ان دنوں ڈلاس میں سالانہ کنونشن ہو رہا تھا اور اس کے منتظمین نے میری آمد کی اطلاع پاکر مجھے "مہمان مقرر" کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ چنانچہ ہفتہ یکم ستمبر کو بالٹی مور سے صبح ساڑھے دس بجے ایسٹرن ایئر لائنز کی پرواز سے جانبِ ڈلاس روانگی ہوئی۔ یہ شہر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بالکل جنوب میں واقع ہے اور بالٹی مور سے اس کا فاصلہ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ چنانچہ پرواز بھی دو حصّوں میں ہوئی۔ پہلے پونے دو گھنٹے میں اٹلانٹا پہنچنا ہوا۔ اور وہاں سے اتنی ہی دیر کی مزید پرواز سے ڈلاس رسائی ہوئی، جہاں مقامی وقت کے مطابق سہ پہر کے تین بجے تھے۔ دن کا کھانا جہاز ہی میں کھایا، جس کے لئے پہلے ہی "کوشر" کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ یعنی یہودیوں کا کھانا جس میں گوشت بھی ذبیحہ ہوتا ہے اور حرام روغنیات بھی استعمال نہیں ہوتیں ——— اٹلانٹا اور ڈلاس دونوں کے ہوائی اڈے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور امریکہ کی مادّی عظمت اور شان و شوکت کا نقش دل پر قائم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک ہوائی مستقر کی وسعت میں ہماری سب سے بڑی ائرپورٹ یعنی کراچی ایسے درجن بھر ہوائی اڈے سما سکتے ہیں۔

ڈلاس ایئرپورٹ پر آئی ایم اے کے صدر ڈاکٹر بشیر الدّین صاحب کے برادرِ خورد بھی موجود تھے اور آئی ایم اے کی ایگزیکٹو میں کینیڈا کے نمائندے برادرم ڈاکٹر سعید المظفر صاحب بھی — لہٰذا کسی دقّت کا سامنا نہ ہوا اور ان کے ساتھ فوراً شیراٹن ہوٹل آگیا جہاں کنونشن ہو رہی تھی رات کو ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر تھا، اس میں شرکت کی اور اس کے بعد میری تقریر تھی۔ لیکن کوئی 'نادیدہ ہاتھ' اُسے سبوتاژ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ چنانچہ پہلے صرف میری تقریر کا اعلان ہوا لیکن بعد میں "مہمان مقرّرین" کی لائن لگ گئی۔ اور "مہمانِ اعلیٰ" (CHIEF GUEST) کو اس وقت دعوتِ خطاب دی گئی جب نصف شب کا عمل ہو چکا تھا اور اکثر مندوبین پر نیند کا اثر صاف نظر آرہا تھا۔ لہٰذا میں نے چار و ناچار کچھ کہا تو سہی لیکن جلد ہی

عرض کر دیا کہ اب دیر ہوگئی ہے، لہٰذا جو کچھ مَیں عرض کرنا چاہتا ہوں، اگر کل کسی وقت موقع مل سکا تو عرض کر دوں گا۔ بظاہر منتظمین نے بھی اسے پسند کیا اور اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد کا وقت طے ہوا، اور اس طرح یہ مجلس ختم ہوئی۔

اگلی صبح کنونشن کا ایک اکیڈمک سیشن تھا اور اس کے بعد بزنس سیشن۔ اور اس کے دوران کچھ اندرونی حالات بھی معلوم ہوئے اور اس 'نادیدہ ہاتھ' کی بھی اصل حقیقت کھُلی، اور وہ یہ کہ ایسوسی ایشن میں دو گروپوں کے مابین اقتدار کی رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک M.S.A. کے زیرِاثر گروپ ہے اور دوسرا اُس کا مخالف۔ چنانچہ انتخاب میں خوب کشمکش ہوئی، اور بڑی تکلیف دہ صورتِ حال سامنے آئی۔ اور اندازہ ہوا کہ انجمنوں اور اداروں میں جو کچھ یہاں ہوتا ہے بالکل وہی کچھ وہاں بھی ہو رہا ہے۔ بہرحال اسی بحث و بز میں صبح کا سیشن طویل ہو گیا اور دوپہر کے کھانے کے بعد کسی تفصیلی خطاب کا ویسے بھی موقع نہ رہا اور دوسرے باہمی اختلافات اور اُن کے نتیجے میں دیئے جانے والے 'استعفوں' کے باعث فضا بھی بہت مکدّر ہو چکی تھی۔ لہٰذا اب کچھ عرض کرنے کے لئے مناسب ماحول موجود نہ تھا ـــ الغرض میرے لئے اس کنونشن میں شمولیّت کا حاصل صرف 'سیر' رہی۔ 'ڈلاس' وہی شہر ہے جہاں آنجہانی جان الیف کینیڈی سابق صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ قتل ہوئے تھے، اور شیراٹن ہوٹل جس میں یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا اس کے عین وسط میں واقع ہے۔ چنانچہ صبح و شام برادرم ڈاکٹر سعید الظفر صاحب کی معیّت میں چہل قدمی بھی رہی اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے حالات و مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہا۔

معلوم یہ ہوا کہ امریکہ کی مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A.) ابتداءً ایک بہت فعّال تنظیم تھی اور اس میں اسلامی جذبہ رکھنے والے سبھی نوجوان شامل تھے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطّے سے تعلّق رکھتے ہوں۔ اور اس نے ایک عرصے تک بہت مفید کام کیا، لیکن بعد ازاں اُس پر کچھ توپیشہ ور لیڈروں نے اپنا تسلّط جما لیا ـــ اور کچھ سعودی عرب سے مالی امداد کی بارش برسنی شروع ہو گئی۔ نتیجۃً اس وقت یہ تنظیم سخت انتشار کا شکار ہے اور اس کے بہت سے مخلص کارکن علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن وہ پیشہ ور لیڈر اپنی اس اصل تنظیم کو خراب کرنے کے بعد دوسری انجمنوں اور ایسوسی ایشنوں پر بھی اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش میں ہیں، جس کے نتیجے میں

انتشار کا عمل اُن تک بھی متعدّی ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصّواب!

بہرحال یکم و دو ستمبر کو ڈلاس میں مقیم رہنے کے بعد ڈاکٹر سعید الظفری کی معیت میں ۳ ستمبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ایئر کینیڈا کے ذریعے ٹورنٹو کے لئے روانگی ہو گئی۔ لگ بھگ چار گھنٹے کے اس سفر کا سعید صاحب کی رفاقت کے باعث پتہ بھی نہ چلا۔ اس سے قبل ڈلاس میں شیراٹن ہوٹل میں بھی میں اور وہ ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اور گفتگو کا کافی موقع ملا تھا۔ اُن کا تعلّق ہندوستان میں الٰہ آباد سے ہے۔ لیکن زندگی کا اکثر و بیشتر حصّہ دیارِ مغرب ہی میں گذرا ہے۔ نہایت صالح اور مجاہدانہ کردار کے حامل مسلمان ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور بغیر کسی کو اطّلاع دیئے الجزائر کے جہادِ آزادی میں جا شریک ہوئے تھے اور وہاں سے کچھ زخمی ہونے کے باعث اور زیادہ تر پھیپھڑوں کے متأثّر ہونے کے باعث ہی واپسی ہوئی تھی۔ اور اب بھی ہمہ تن اسی انتظار میں ہیں کہ پھر کہیں "جہاد بالسّیف" کا موقع ملے تو سب کچھ تج کر جا شامل ہوں۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ ؎

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر ٭ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ٹورنٹو ڈلاس اور ٹورنٹو کے مابین فاصلہ تو لگ بھگ دو ہزار میل ہے تاہم چونکہ دونوں تقریباً ایک ہی طول بلد پر واقع ہیں، لہٰذا دونوں کے وقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ جب ہم چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ٹورنٹو پہنچے تو وہاں بھی دوپہر کے ساڑھے بارہ ہی بجے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹے میں کسٹم اور امیگریشن والوں کی پوچھ گچھ سے خلاصی ہوئی اور اب جو باہر آیا تو حیران رہ گیا۔ اِس دُور دراز شہر میں ہفتہ وار تعطیل (WEEKEND) کے بعد پہلے کام کے دن (WORKING-DAY) یعنی پیر کے روز پندرہ بیس حضرات استقبال کے لئے موجود تھے جن میں سے اس سے قبل صرف ایک صاحب سے ایک بار کراچی میں ملنا ہوا تھا، اور ایک ہی اور صاحب تھے جن سے غائبانہ تعارف تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تعارف تو غائبانہ نہیں تھا، بلکہ کوئی بیس سال قبل کی ملاقات بھی تھی!) اس سے اندازہ ہو گیا کہ یہاں معاملہ کچھ مختلف ہے ـــــ !!!

وہ صاحب جن سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اور جنھوں نے کینیڈا کے اس صنعتی شہر کے مسلمان آبادکاروں (IMMIGRANTS) میں میرا تعارف اکثر و بیشتر بذریعہ TAPES اور کچھ کچھ بذریعہ کتب کرایا تھا وہ سمیع اللہ صاحب ہیں، جن کا اصل تعلق لکھنؤ سے تھا، جہاں سے مہاجر ہو کر وہ پاکستان آئے اور یہاں لاہور ہی میں کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، پھر کچھ عرصہ پاکستان میں مختلف جگہوں پر ملازمت کرتے رہے اور بالآخر ہزاروں بلکہ لاکھوں پاکستانی نوجوانوں کی طرح بلادِ مغرب کا رُخ اختیار کر لیا۔ انہوں نے یہاں درسِ قرآن کے پروگرام کے لئے بہت محنت کی تھی، جس کے نتیجے میں استقبال کرنے والے حضرات کی آنکھوں میں محبت کی جھلک بھی صاف نظر آئی۔ اور ان کے انداز سے صاف معلوم ہوا کہ انھیں میرے درسِ قرآن کا نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے۔

سمیع اللہ صاحب نے تو اس پروگرام کے لئے دو ہفتے کی چھٹی ہی لے لی تھی اور وہ اس پورے عرصے کے دوران میرے ساتھ تقریباً سائے کی طرح لگے رہے۔ میرا قیام بھی اُن ہی کے مکان پر رہا — درمیان میں صرف دو تین دن کے لئے برادرم حافظ سعید صاحب اپنے گھر لے گئے۔ (یہی وہ دوسرے صاحب ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے، ان کے والد ماجد مولانا عبدالعزیز مرحوم و مغفور منٹگمری کی جامع مسجد نور کے خطیب تھے اور مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز، اب میری اِن سے عزیز داری بھی ہو گئی ہے۔ یعنی میرے خویش عزیز محمود میاں کی ہمشیرہ ان کے گھر میں ہیں۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ کبھی اُن سے ملاقات بھی ہوئی ہے لیکن انہوں نے کہا کہ وہ بچپن میں میرے زیرِ علاج رہے ہیں — یہ بھی اب کئی سال سے ٹورنٹو میں مقیم ہیں اور کچھ ملازمت کا شغل بھی ہے اور کچھ ذاتی کاروبار کا بھی۔)

بہرحال ایئرپورٹ پر تشریف لانے والے حضرات سے مختصر ملاقات کے بعد سمیع اللہ صاحب کے مکان پر آنا ہوا۔ جہاں سہ پہر میں کچھ آرام کیا۔ شام کو ایک غیر رسمی ملاقات اور اجتماعی طعام کا اجتماع تھا، جس میں پینتیس ۳۵ کے لگ بھگ حضرات شریک ہوئے۔ تعارف ہوا تو محسوس ہوا کہ سبھی نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ چنانچہ کوئی انجینئر ہے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی پروفیسر۔ تیس ۳۰، پینتیس ۳۵ اشخاص کے اس مجمع میں کم و بیش نصف درجن تو پی ایچ ڈی تھے۔ اب صرف چند نام یاد رہ گئے ہیں۔ مثلاً ا۔ ڈاکٹر

عبدالفتاح صاحب سرحق ہیں، حیدرآباد (دکن) سے تعلق ہے اور آج کل کچنر میں مقیم ہیں جو ٹورنٹو سے لگ بھگ اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کے دینی جذبے اور ذوق و شوق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس قدر فاصلے سے تقریباً روزانہ درس میں شرکت کے لئے آتے رہے۔ (۲) ڈاکٹر نسیم خان جنھوں نے بچّوں کی نفسیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے، اُن کا تعلق پاکستان میں اسلامی جمعیّت طلبہ سے رہا ہے اور اب بھی فعّال دینی مزاج رکھتے ہیں۔ (۳) نذیر احمد صاحب، ان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن ہی سے ہے۔ دینی تقریبات میں بہت سرگرم رہتے ہیں اور کینیڈا سے حج کے قافلوں کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ (۴) ڈاکٹر ریاض منیر نظامی صاحب ٹورنٹو کے مشہور اور مقبولِ عام معالجین میں سے ہیں، الرجی کے اسپیشلسٹ ہیں۔ (۵) قاضی اورنگ زیب صاحب۔ ان کا تعلق گوجرانوالہ سے ہے، فنِ تعمیرات میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور اپنی ذاتی فرم چلا رہے ہیں۔ (۶) ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری۔ دہلی سے تعلق ہے اور تعلیمات میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ (۷) مسٹر مولا دینا۔ بمبئی سے تعلق ہے، وکالت کرتے ہیں۔ اقبالیات سے بہت شغف رکھتے ہیں۔ "اقبال اکادمی" کے نام سے ایک ادارہ ٹورنٹو میں قائم کیا ہوا ہے۔ (۸) خواجہ سعید الدّین صاحب نہایت خاموش طبع انسان ہیں اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل — مغرب اور عشاء کی نمازیں اِن سب حضرات کی معیّت میں بوسلیڈر روڈ کی جامع مسجد میں ادا کیں جہاں اگلے روز سے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔

۴ ستمبر کو بعد نمازِ مغرب پہلا درس تھا۔ مغرب سے قبل مسجد کے ہال میں داخل ہوتے ہی خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ دو صد سے زائد لوگ جمع تھے، خواتین جو ایک گیلری میں تھیں، اس کے علاوہ تھیں۔ بچّے بھی زرق برق لباس پہنے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ بالکل کسی خوشی کی تقریب (FESTIVAL) کا سا گمان ہوتا تھا۔ لوگوں کا ذوق و شوق دیدنی تھا۔ جو بیان میں نہیں آسکتا۔ درس کے لئے زیادہ وقت لگانے کے لئے عشاء کی نماز کو مقرّرہ وقت سے نصف گھنٹہ مؤخّر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پونے دو گھنٹے سے لگ بھگ درس جاری رہا، لیکن پھر بھی سورۃ العصر کا بیان مکمّل نہ ہوسکا۔

۵ ستمبر کے دن کا اکثر حصّہ ٹورنٹو کی سیر میں گذرا۔ چنانچہ شہر کے مرکز بالخصوص سٹی ہال کی سیر کی۔ پھر سی این ٹاور پر چڑھ کر ارد گرد کا نظارہ کیا۔ یہ انسانی ہاتھوں کی بنی

ہوئی دُنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ اور اس سے بہت دُور دُور تک کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ اُوپر سیّاحوں کے لئے دُوربینیں بھی نصب ہیں تاکہ خوب دُور دُور تک دیکھ سکیں۔ اس کے بعد 'ٹورنٹو پلیس' کی سیر کی۔ یہ یہاں کی خوبصورت ترین سیرگاہ ہے جو جھیل ٹورنٹو کے کنارے واقع ہے۔

شام کو درس کے لئے مسجد میں حاضری ہوئی تو برادرم خرّم جاہ مراد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ آج کل انگلینڈ میں پروفیسر خورشید صاحب کے قائم کردہ ادارے 'اسلامک فاؤنڈیشن' میں بحیثیت ریذیڈنٹ ڈائرکٹر ان کی نیابت کر رہے ہیں، اور امریکہ کے 'حلقۂ احباب اسلامی' کی دعوت پر تشریف لئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مانٹریال میں ایک تربیت گاہ میں شرکت کر چکے تھے اور اب امریکہ کے دوسرے شہروں کے دورے پر تھے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ہو جائے تو اچھا ہے کہ شمالی امریکہ میں جماعتِ اسلامی سے منسلک لوگ اس حلقے کی صورت میں منظّم ہیں اور ٹورنٹو میں چند مخلص کارکنوں پر مشتمل اس کی ایک چھوٹی مگر فعّال شاخ موجود ہے۔

درس میں حاضری بالکل کل جیسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی قدرے زائد۔ مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کا درس اوّل مشتمل بر سورۃ العصر مکمّل ہوا اور دوسرے درس یعنی آیۂ برّ کا آغاز ہوا۔

۶ ستمبر کو سمیع اللہ صاحب کے ساتھ نیاگرا جانا ہوا، جہاں مشہورِ زمانہ آبشار کی سیر کی۔ نیاگرا بھی ٹورنٹو سے تقریباً اسّی میل دور ہے۔ راستے سے ذرا ہٹ کر کچنر واقع ہے۔ جاتے ہوئے وہاں ڈاکٹر عبدالفتّاح صاحب کے مکان پر ناشتہ کیا۔ دن کا کھانا نیاگرا میں جناب اقبال گدائی صاحب کے یہاں کھایا۔ شام کو نیاگرا سے واپسی ہوئی اور حسبِ معمول درس ہوا، حاضری میں مزید اضافہ ہوا۔ آیۂ برّ کا درس مکمّل ہوگیا۔

۷ ستمبر کو جمعہ تھا۔ اب تک درس کی مجالس میں تو صرف اُردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن جمعہ میں مقامی لوگ بھی ہوتے ہیں اور کچھ عرب حضرات بھی، لہٰذا مختصر خطبۂ جمعہ انگریزی میں دیا۔ موضوع تھا: "جمعہ کی اصل حکمت، اور خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد!" ـــــ چار پانچ صد حضرات شریک تھے، لیکن جمعہ یہاں

مختصر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ چھٹی تو ہوتی نہیں، اکثر لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے ہی کو کچھ کھینچ تان کر قدرے لمبا کرتے ہیں اور اسی میں جمعہ ادا کرتے ہیں ۔
شام کو سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۶ کا درس ہوا۔ حاضری ڈھائی پونے تین سو سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گویا ذوق و شوق بجائے گھٹنے کے بڑھ رہا تھا۔ فللّٰہ الحمد و المنّۃ ۔ درس سے قبل اچانک جناب عثمان سیٹھ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ پاکستان کے مشہور صنعت کار سیٹھ احمد داؤد کے بھانجے ہیں اور ۶۱-۶۲ء میں یونیورسٹی ٹیکسٹائل ملز کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ انہیں درس میں شریک دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے دن ہی سے مسلسل آ رہے ہیں۔ میں ہجوم میں اس سے قبل انہیں پہچان نہ سکا۔ (جاری ہے!)

بقیہ درسِ قرآن صفحہ ۱۴ سے آگے

بقیہ درسِ قرآن صفحہ ۱۴ سے آگے

یہ اُس کا طریقہ ہونا چاہئے اور پھر دعوت کے بعد صبر کا مرحلہ آتا ہے۔ جب انسان نے دعوت دے دی، اب اس صورت میں اگر گالیاں دی جاتی ہیں، اگر بُرا بھلا کہا جاتا ہے تو ایسے موقعوں پر صبر کیا جائے اور کوئی انتقامی جذبہ کارفرما نہ ہو۔ اگر انتقامی جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر ایسی صورت میں وہ داعی اپنی دعوت کے تمام ثمرات سے محروم ہو جاتا ہے، پھر اس کو اس کے ثمرات (دعوت کے) نہیں مل سکتے، تو یہ خلاصہ ہے سورۂ عصر کا، فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

یہ عجیب بات ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اعزاز میں یہ عصرانہ دیا گیا، لیکن وہ تشریف نہیں لا سکے۔ اب یہ ہے کہ وہ آنے والے تھے اور میں جانے والا ہوں حجازِ مقدس۔ لہٰذا کچھ تھوڑا بہت موقع مل گیا کہ میں آپ سے مخاطب ہو سکوں۔

اللہ تعالیٰ صحیح ایمان اور عملِ صالح اور دعوتِ حق اور اس راہ میں صبر کی توفیق ہمیں عطا فرمائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ماہ ربیع الاول کا تحفہ

خود پڑھئے اور احباب کو پیش فرمائیے

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلّق کی بُنیادیں

کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔

صفحات ۴۰ ، بڑا سائز ، قیمت فی نسخہ -/۲

سیرت و تاریخ کے موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقاریر کے CASSETTS کے جو SET تیار کرائے گئے تھے وہ ختم ہو گئے ہیں اور مزید تیار کرائے جارہے ہیں اب گرانی بڑھ جانے کے باعث ان کی قیمت فی سیٹ -/۳۰۰ روپے ہوگی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور - ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

Regd.L. No. 7360

MONTHLY MEESAQ LAHORE

Vol. 29 | February 1980 | No. 1-2

ان شاء اللہ العزیز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام ساتویں سالانہ

قرآن کانفرنس

۲۳ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۰ء اتوار تا جمعرات

قرآن اکیڈمی

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

کی زیرتعمیر جامع مسجد کے ہال میں منعقد ہوگی۔

مفصل اعلان کا انتظار فرمائیں

المعلن: محمد عقیل، ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

پرنٹر: چوہدری رشید احمد — مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور